نصیر احمد ناصر

ربِ لامکاں کا صد شکر ہے کہ اس نے ہمیں توفیق دی کہ ہم اردو ادب کی کتب کو سافٹ میں تبدیل کر سکے۔ اسی صورت میں یہ کتاب آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ مزید اس طرح کی عمدہ کتب حاصل کرنے کے لئے ہمارے گروپ میں شمولیت اختیار کریں۔

انتظامیہ برقی کتب

گروپ میں شمولیت کے لئے:

عبداللہ عتیق: 8848884 347 -92+

محمد ذوالقرنین حیدر: 3123050300-92+

اسکالر سدرہ طاہر صاحبہ: 0120123 334 -92+

سُرمئی نیند کی بازگشت
نصیر احمد ناصر

سُرمئی نیند کی بازگشت

نصیر احمد ناصر

بک کارنر
جہلم، پاکستان

انوار فطرت کے نام

Surmai Neend Ki Bazgasht
by Naseer Ahmed Nasir
Jhelum: Book Corner. 2017
248p.
1. Poetry - Urdu Literature
ISBN: 978-969-662-114-0

Surmai Neend Ki Bazgasht (Nasri Nazmain)
Poet : Naseer Ahmed Nasir
Published : December 2017
Title Painting : Aliya Mirza
Back Title Photograph: Hafeez Tahir
Printed by: Zahid Bashir Press, Lahore

سُرمئی نیند کی بازگشت (نثری نظمیں)
شاعر: نصیر احمد ناصر
اشاعت: دسمبر ۲۰۱۷ء
سرورق مصورہ: عالیہ مرزا
پس سرورق تصویر: حفیظ طاہر
پرنٹرز: زاہد بشیر پریس، لاہور

Published by:
Gagan Shahid & Amar Shahid
Book Corner
Printers, Publishers & Booksellers
Jhelum — Pakistan.

ناشر:
گگن شاہد، امر شاہد
بک کارنر
پرنٹرز، پبلشرز اینڈ بک سیلرز
جہلم، پاکستان

- join us on facebook -
Naseer Ahmed Nasir
Book Corner Showroom
Book Corner Publisher

ترتیب

میں پرندوں کی طرح طلوع ہونا چاہتا ہوں

میں جانتا ہوں
میرا سفر ختم ہونے والا ہے
نیند آنکھوں میں پڑاؤ ڈال چکی ہے
اور اندھیرے کی ساکن آواز
کہیں بہت قریب سے سنائی دے رہی ہے
لیکن میں سونا نہیں چاہتا
نظم، کچھ دیر اور میرے ساتھ رہو
مجھ سے باتیں کرو
مجھے تنہا مت چھوڑو
میں اِس رات کی صبح دیکھنا،
اور پرندوں کی طرح
تمہارے ساتھ طلوع ہونا چاہتا ہوں!

ناؤ پانی کی موت سے ڈرتی ہے

ناؤ کے لیے پانی ضروری ہے
وہ لکڑی کی ہو یا کاغذ کی
اُسے بہنے کے لیے پانی چاہیے
پانی اُسے لذتِ سفر کی انتہاؤں تک لے جاتا ہے
نئے جزیروں، نئی آبناؤں کی سیر کراتا ہے
ناؤ پانی سے پیار کرتی ہے

ناؤ کو تیرتے رہنا اچھا لگتا ہے
وہ پانی کے پیٹ پر گدگدی کر کے خوش ہوتی ہے
اور لہریے بناتی ہوئی چلتی ہے
کنارہ اُسے باندھے رکھتا ہے
کنارہ کتنا ہی خوبصورت کیوں نہ ہو

ناؤ کا دل اس میں نہیں لگتا
وہ اپنے مانجھی سے محبت کرتی ہے
اُسے مچھلیوں کی باس
لہروں کا شور
اور ملاحوں کے گیت پسند ہیں

ناؤ منتظر رہتی ہے
نت نئے مسافروں کی
تا کہ انہیں اُس پار لے جائے
جہاں راستے قدموں کی راہ دیکھتے ہیں
اور پارینہ بارگاہوں کے دروازے
خوش اندام عورتوں کے لیے کھلے رہتے ہیں

ناؤ کے کان بڑے حسّاس ہوتے ہیں
وہ ہوا کی سرگوشیاں
اور مسافروں کی باتیں سُن لیتی ہے
اور انہیں پانیوں تک پہنچا دیتی ہے
پانی بادلوں کو
اور بادل بارشوں کے ذریعے
ساری باتیں زمین کو بتا دیتے ہیں

زمین رازوں کا جنگل ہے
جس میں ہر روز چوری ہو جاتی ہے
انسان اپنے ہی رازوں کو
کاٹ کاٹ کر بیچتا رہتا ہے
حتیٰ کہ ایک دن زمین درختوں سے،
انسان رازوں سے
اور ناؤ مسافروں سے خالی ہو جاتی ہے!

ہم بارانی لوگ ہیں

ہم بارانی لوگ ہیں
وہ نہیں جانتے
ہم اپنے اُونچے نیچے کھیتوں، ڈِھلمِل موسموں
اور جھاڑیوں بھرے قبرستانوں کو کبھی نہیں چھوڑتے
اور جڑی بوٹیوں کی طرح
فصل در فصل اُگتے رہتے ہیں
وہ ہمیں تلف کرنے کے لیے
نت نئے اسپرے چھڑکتے ہیں
ہم پھر اُگ آتے ہیں
ہم پر خس و خاشاک مارنے والے

کیمیاوی زہر اثر نہیں کرتے
ہم جہاں جاتے ہیں
اپنی مٹی، اپنی ہریالی ساتھ رکھتے ہیں

ہم بارانی لوگ ہیں
وہ نہیں جانتے
شہروں میں رہتے ہوئے بھی
ہماری آب و ہوا میں کیکر کے پھولوں کی خوشبو بسی ہوتی ہے
اور ہمارے سروں پر سدا شیشم کی چھاؤں رہتی ہے
ہم دھوپ اور تیز بارش سے نہیں ڈرتے
ہم ایک نہیں دو نہیں
ہماری پشت پر پورا دِہ ہوتا ہے
وہ کبھی نہیں جان پائیں گے
ہمارے دروازے اونچے، صحن کھلے، برآمدے لمبے،
دل بڑے اور جسم کھردرے کیوں ہوتے ہیں
ہم آبادیوں میں گم ہوتے ہوئے راستے ہیں
اور شاملات کے رقبے ہیں
ان کے کمپیوٹر ہماری شناخت نہیں کر پائیں گے
ہم درختوں، چراگاہوں اور جولائی کے بادلوں جیسے ہیں
ہمارا کھرا پانے کے لیے

انہیں زمین و آسمان کی خانہ شماری کرنی پڑے گی

ہم بارانی لوگ ہیں
ہم جانتے ہیں
وہ ہمیں کاغذوں کی مار ماریں گے
رپٹوں اور مِسلوں میں گھسیٹیں گے
اور ہماری بے ضرر حرکات و سکنات پر ٹیکس لگا دیں گے
ہمیں دفتروں، تھانوں، کچہریوں کے پھیرے لگوا لگوا کر
ایک دن داخل دفتر کر دیں گے
لیکن وہ نہیں جانتے
ہم بارانی لوگ ہیں
اُگنا اور پھیلنا ہماری مجبوری ہے
ہم ان کے روزنامچوں سے نکل کر
گھر گھر، گلی گلی، شہر شہر پھیل جائیں گے
فلک بوس عمارتوں کے لیے
ہموار کی گئی زمینوں پر
قبروں کی طرح اُگ آئیں گے!!

سُرمئی نیند کی بازگشت

اُداسی مجھے تخلیق کرتی ہے
ہر روز ایک نئی نظم میں
میں جنگلوں اور پہاڑوں کے گیت سنتا ہوں
اور زمانوں کی قدامت میں گونجتا ہوں
میں بے گزر، دراز راستوں کا راگ ہوں
اور ہوا کے قدموں کی سُریلی صدا
میں راتوں کا آرکیسٹرا ہوں
اور دنوں کے البم میں محفوظ کیا ہوا نغمۂ ساز
میں زندگی کے شور میں سنائی نہیں دوں گا

دُنیا سماعت کا دھوکا ہے
صرف ایک دھماکے کی مار

جہاں محبت کی آواز
ہوا کی سرگوشیوں کے سنگ
آبادیوں کے آس پاس بھٹکتی رہتی ہے
اور گھروں اور دلوں میں داخل ہونے سے گھبراتی ہے
اور جہاں بوڑھی آتمائیں
جوان جسموں کے اندر بھنگڑا ڈالتی ہیں

اے خاموش سمفنی کے خدا!
بادلوں کے پروں کی سرسراہٹیں
صرف مجھے کیوں سنائی دیتی ہیں؟
بچے اپنے اپنے کمروں میں سکون کی نیند سو رہے ہیں
اور باہر بارش
کوئی نئی دُھن ترکیب دینے میں مصروف ہے
دروازے اندر سے بند ہیں
اور کھڑکیاں ٹیرس کی طرف منہ کھولے ہوئے بیٹھی ہیں
اور میں ٹیبل لیمپ کی محدود روشنی میں سوچ رہا ہوں
کہ کچھ کتابیں پڑھے بغیر ختم کیوں ہو جاتی ہیں
اور جو شب گزار
صبح کا سورج
اور شام کا ستارہ نہیں بن سکتے

وہ کہاں طلوع ہوتے ہیں؟

رات کا سوناٹا ختم ہونے سے پہلے
مجھے خواب کے اُس سرے کی طرف جانا ہے
جہاں کسی آنکھ، کسی صبح کے آثار نہیں
بس سرمئی نیند ہے
لاشوں اور مچھلیوں کی طرح
ایک دوسری کے اوپر ڈھیر کی ہوئی
مسلسل نیند ——
مجھے اُس نیند کی بازگشت سنائی دے رہی ہے!

گلوریا جینز میں شام

آج بہت دنوں بعد
گلوریا جینز میں کافی پیتے ہوئے
آخری سِپ کے ساتھ
شام کو بھی انڈیل لیا ہے منہ میں
معدہ چاکلیٹی تنہائی سے لبالب ہو گیا ہے
اور تم کاغذی مَگ ہاتھ میں پکڑے
ہمیشہ کی طرح منہ کھولے، ساکت و صامت
ناگاہ ہونے والی اِس ملاقات میں
میری طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہی ہو
کہ آفرینش سے پہلے تھا ہُوا وقت
گلوریا جینز میں کیسے آ گیا ہے

جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تھا

شام اِسی طرح مٹ میلی تھی
تاریخ ابھی شروع نہیں ہوئی تھی
زمین پر صرف جغرافیہ تھا
پرندوں اور جانوروں کا ترتیب دیا ہُوا
اور وقت سایوں کی طرح چلتا تھا
اور تم یونہی حیران و پریشان
میری طرف دیکھ رہی تھیں

تم نے کبھی خود کو باخبر نہیں رکھا
تمہیں نہیں معلوم کہ اِن دنوں
میری دُنیا کتنی چھوٹی سی ہے
عالمِ نبات وحشرات کی طرح
جس میں چیونٹیوں کی قطاریں ہیں
پرندوں کے گھونسلے ہیں
لچک دار پلاسٹک کے سانپ اور کیڑے مکوڑے ہیں
اور آئس ایج کے زمانے سے کھیلنے والا
ایک ننھا نواسا ہے
اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟
سائبر ایج کے بچے
کھلونوں سے نہیں زمانوں سے کھیلتے ہیں

اور کھیل ہی کھیل میں
تاریخ کا آغاز ہو جاتا ہے
اور خاتمہ بھی ——
پانی پر تیرتے مکان اور آبی شاہراہیں
اور مصوّروں اور مجسموں کے شہر
آباد ہوتے اور اجڑ جاتے ہیں
بادشاہوں کی میّتوں کے ساتھ
ہزاروں مصاحبین زندہ دفن کر دیے جاتے ہیں
اور عہد بہ عہد صدیاں ویران ہو جاتی ہیں

تمہیں نہیں یاد کہ دوسری بار
میں نے تمہیں دُشمن سرزمینوں کے عین وسط میں دیکھا تھا
زیرِ زمین سرنگوں میں
جھک کر چلتے ہوئے اور رینگتے ہوئے
اور غاروں کے اندر بنے ہوئے گھروں میں
جہاں سوراخوں اور چمنیوں سے تازہ ہوا آتی تھی
گہری نیند میں
خوابوں کو کیموفلاژ کیے ہوئے
اور ہونٹوں کے بیچ مسکراہٹ کی لکیر کھینچی ہوئی
جیسے دُنیا کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہو

اب تو دُنیا اتنے ٹکڑوں میں بٹ چکی ہے
کہ اسے دِکھانے کے لیے
ہاتھوں کی لکیریں بھی ناکافی ہیں

اور اِس جگہ
جہاں اب شہر آباد ہے
اور ہم بیٹھے ہوئے ہیں گلوریا جینز میں
میں نے تمھیں آخری بار دیکھا تھا
یہاں چند گھر تھے،
ایک راستہ تھا، ایک موڑ تھا، جہاں میں کھڑا تھا
بدترین شکستوں اور ہزیمتوں کے ساتھ
گلیاں سنسان اور چھتیں خالی تھیں
درختوں اور مکانوں سے دھواں اٹھ رہا تھا
اور تمھاری صرف ایک جھلک تھی
دشمن نے دلوں اور ذہنوں کے سارے رابطے جام کر دیے تھے
پہاڑوں نے ہمیں پناہ نہیں دی تھی
اور بادل بے وقت برس رہے تھے

اور آج پھر —— یگوں بعد
ہم مِلے ہیں گلوریا جینز میں

اور ہمیشہ کی طرح تمھیں نہیں معلوم
کہ ہم ایک ہی ہاؤسنگ سوسائٹی میں رہتے ہیں
ہماری کوئی تاریخ ہے نہ جغرافیہ
بس ایک سِوِک سینٹر ہے
اور ایک قبرستان
اور گلوریا جینز میں
وقت تھما نہیں، روشنی کی رفتار سے سڑپ رہا ہے!

پسپائی اور محبت کی آخری نظم

جب کشتیاں دریاؤں سے
اور کنارے پانیوں سے اُوب جائیں
اور راستے بستیوں کے نواح سے گزرتے ہوئے
اچانک کسی ہائی وے کی زد میں آ کر کچلے جائیں
تو سمجھ لینا
زمین پر میرے اور محبت کے دن پورے ہو چکے ہیں
اور میں آخری معرکہ بھی ہار چکا ہوں
اور تمہاری بھیجی ہوئی دعاؤں کی کمک
اور محافظ تعویذوں سمیت مارے جانے سے پہلے
کسی تنگ نشیبی راستے میں
زخموں کی تاب لانے

اور تاب کار شعاعوں سے آکسیجن کشید کرنے کی
بے سود کوشش کر رہا ہوں
اور عین جنگاہ میں
تمہارے لیے لکھی ہوئی نظمیں
اور امن خوابوں سے بھری ہوئی ڈائریاں
اُن درختوں کے ساتھ ہی کوئلہ بن چکی ہیں
جو شعاعی حملے سے پہلے
پھولوں سے لدے ہوئے تھے
اور جن کے نیچے میں آخری بار بیٹھا تھا
اور سوکھی روٹی کے ٹکڑے بمشکل حلق سے اتارے تھے
اور پانی کے بچے کھچے چند قطروں سے ہونٹ تر کیے تھے

اور جب تم دیکھو
کہ وقت اچانک رک گیا ہے
اور شام کی اذانیں بلند ہونے سے پہلے دن طویل ہو گیا ہے
اور کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے
تمہیں ہر چیز بدلی ہوئی لگے
تو بے چین ہو کر مجھے یاد نہ کرنا
ورنہ وہ آسانی سے
تمہارے دل کے راستے سے مجھ تک پہنچ جائیں گے

اور میری موت کو
فتح کی نشانی کے طور پر حنوط کر لیں گے

اور جب میرے بجائے
جانور نما کوئی مخلوق
تمہارے فارم ہاؤس پر پہنچے
تو حیران مت ہونا
اور چپکے سے دروازہ کھول دینا
اور وہ استقبالی بوسے
جو تم نے میرے لیے پس انداز کر رکھے ہیں
کسی خلائی بھیڑیے کے برقی ہونٹوں سے مَس کرتے ہوئے
رو مت پڑنا
ورنہ زمین پر ہمیشہ کے لیے دھویں کے بادل چھا جائیں گے

اور جب ہوا کا آخری جھونکا
پورٹیکو میں سے گزرتے ہوئے
سرگوشیوں میں میرا پیغام ڈی کوڈ کرنے کی کوشش کرے
تو اُس طرف مڑ کر مت دیکھنا
ورنہ وہ تمہاری روح کے کمزور ترین حصے سے واقف ہو جائیں گے
اور وہیں اپنے مشینی دانت گاڑ دیں گے

اور سنو!
مکمل سپردگی سے پہلے
کسی اور نشانی کا انتظار مت کرنا
انسانی ادوار میں
محبت کا مرنا آخری نشانی ہے!!

اپالو اور اتھینا —— حالتِ التوا میں لکھی گئی نظم

منظومہ!
میں نے تمہیں بارہا دیکھا ہے
بارگاہوں، خانقاہوں اور تاریخ کی رہداریوں سے گزرتے ہوئے
بیلوں، باروں، دوآبوں میں چلتے ہوئے
بظاہر تمہاری عمر میری عمر سے کم ہے
لیکن تمہاری محبت کے پاؤں
عمر رسیدہ زمانوں کی گرد سے اٹے ہوئے ہیں
اور تمہارا سینہ
دُودھیا کائناتی روشنیوں سے بھرا ہوا ہے
جانے تم کن کہکشاؤں سے آتی ہو
کن مُلکوں، اقلیموں سے گزرتی ہو
اور کن دارالخلافوں کی جانب رواں رہتی ہو
بدن کا لباس پہنے ہوئے تمہاری روح
جب میرے پانیوں میں اترتی ہے

تو دھوپ میں سکڑے سمٹے اور سوکھے ہوئے
سگریٹ کے دھویں جیسے
اِکا دُکا بادلوں کو بھی بھیگنا آ جاتا ہے
پیاس کا دریا ہونا کتنا بڑا پیراڈوکس ہے
یہ تو کوئی جل کھور مٹی کا کنارہ ہی بتا سکتا ہے
ہم کاغذی کشتیوں سے کھیلنے والے
بالٹی بھر پانی کو بھی سمندر سمجھ لیتے ہیں
اور اِس تھوڑی دیر کی مِنی اوڈیسی میں
اپالو اور اتھینا بن جاتے ہیں!

ہمارا کوئی دریا ہے نہ سمندر
بادباں نہ مستول
ہم محبت کے ڈیلٹا ہیں
اور تیرنے کے بجائے ڈوبنا بلکہ دھنسنا پسند کرتے ہیں
اپنی ہی دلدلوں میں
جب تک کہ کوئی باز وہمیں پکڑ کر کھینچ نہ لے
اور ہمارے کیچڑ سے بھرے جسموں کو
شاور کے نیچے کھڑا کر کے
دنیا کی ساری بارش ہمارے اوپر نہ انڈیل دے
یہی محبت ہے

کیچڑ کو اجلا کر دینا
مٹی اور پانی کو یک رنگ کر دینا
اور خوابی تھیلے میں گُھس کر سکون کی نیند سو جانا!

منظومہ!

ایک خواب سے دوسرے خواب میں جانا آسان نہیں ہوتا
جیسے ایک خلا سے دوسرے خلا میں
ایک آگ سے دوسری آگ میں
ایک پانی سے دوسرے پانی میں
ایک بدن سے دوسرے بدن میں
ایک عمر سے دوسری عمر میں
جانے کتنی عمریں اسی ادھیڑ بُن میں گزر جاتی ہیں
اور ہم ایک چھوٹی سی جست بھرتے ہوئے گھبراتے ہیں
آنکھ کُھل گئی تو کیا ہو گا؟
جس طرح پھول کا کِھلنا بہار کی علامت ہے
اس طرح آنکھ کا کُھل جانا ہی محبت ہے
بند آنکھوں سے مرا تو جا سکتا ہے
محبت نہیں کی جا سکتی
محبت موت کا التوا ہے!
محبت زندگی کا اجراء ہے!!

تنہائی ایک ملاقات سے شروع ہوتی ہے

تنہائی ایک ملاقات سے شروع ہوتی ہے
اور پھیلتی چلی جاتی ہے
کبھی نہ ختم ہونے کے لیے
وہ کتنے خوش رہتے ہیں
جو بظاہر مِل کر بھی دراصل نہیں ملتے
اور دلوں میں جھانکنے کی زحمت نہیں کرتے
دل کا دل سے
روح کا روح سے
اور شریر کا شریر سے ملنا
یہ سب تنہا ہونے کے جتن ہیں
پتا نہیں
زندگی تنہائی کے بغیر ادھوری ہے
یا تنہائی زندگی کے بغیر

لیکن ہم جہاں جاتے ہیں
اپنی تنہائی ساتھ لے جاتے ہیں
اور جہاں ٹکتے ہیں
یہ ہمارے بیچ یا کہیں آس پاس
کنڈل مار کر بیٹھ جاتی ہے
گاہے زیادہ
گاہے کم ہونے سے
تنہائی کے اعداد و شمار میں فرق نہیں پڑتا
یہ گنتی میں ستاروں کی طرح بے حساب
رقبے میں آسمان جیسی بے کنار
اور حجم میں کائنات سے بڑی ہے
تنہائی کا ٹھور ٹھکانا بتانا مشکل ہے!

سرمائی بارش میں بحرِ ابدیت کی جانب

سرمائی بارش کی آواز
زمانوں دُور لے جاتی ہے
آبائی راستوں سے گزرتے ہوئے
قدموں کی آواز سنائی نہیں دیتی
وقت زمین کو آگے کی طرف دھکیلتا رہتا ہے
لیکن مٹی اپنی جگہ نہیں چھوڑتی
ایک مکان سے دوسرے، دوسرے سے تیسرے تک
ڈمپر اور مشینیں تھک جاتی ہیں
گزرے وقتوں کے خلا نہیں بھرتے
سفالینہ کا رنگ تہذیبوں کی طرح گہرا
اور صحنچی میں لگی اینٹوں سے زیادہ پختہ ہوتا ہے
درختوں اور فصلوں کی شاعری
صرف ہوا پڑھ سکتی ہے

جو دروازوں، دریچوں، درزوں

اور دلوں سے

دبے پاؤں گزرتی ہے

یا رنگین چونچوں اور پروں والے پرندے

جو رات کے گھنے جنگلوں میں

صبح دم چہچہانے کے لیے

دم سادھے پڑے رہتے ہیں

دن بھر دانہ چگتے، جفتی کرتے

اور گھونسلوں اور کھوڑوں میں انڈے سیتے ہیں

یا ارضیہ جیسی کوئی چیز

جو اندر ہی اندر سرسر کرتی

عمروں اور لفظوں کی خاموشی تک چاٹ جاتی ہے

اور بچے کمروں میں

اندھیرے کی لوری سن کر

جھوٹ موٹ آنکھیں بند کر لیتے ہیں

اور خدا اور باپ دونوں تنہا ہوتے ہیں

جو غیر مرئی اونگھ میں بھی جاگتے رہتے ہیں

دکھائی نہ دینے والے آنسوؤں کی چاپ

سنائی دیے بغیر آتی رہتی ہے

اور پانی بند کھڑکی کے شیشوں پر

بے آواز گرتا چلا جاتا ہے

اور بارش ہوتی رہتی ہے

دیر تک اور دُور تک

اور ایک درد کا دریا

بحرِ ابدیت کی جانب بہتا رہتا ہے

اور زمانے گزرتے چلے جاتے ہیں

آتش دان کے پاس

جُھولا کُرسی (راکنگ چیئر) پر

کوئی جھولتے جھولتے سو جاتا ہے!

وزیر کوٹ کسی جگہ کا نام نہیں

وزیر کوٹ کسی جگہ کا نام نہیں
تو پھر وہ کیا ہے؟
کس اٹلس کا علاقہ ہے؟
کون سی نقطہ گاہ ہے؟
جہاں وہ دھرتی کا ابھار بن کر
حالتِ دوام میں لیٹا ہوا
زمانوں کا سکوت نظما رہا ہے

وزیر کوٹ، جہاں میں کئی بار گیا ہوں
اور پاپلر کی لمبی قطاروں کے درمیان
ایک مدبر سائے کے ساتھ سیر کرتے ہوئے
کتنی جگہوں اور نا جگہوں سے گزرا ہوں
جہاں کتابوں کے ڈھیر میں بچھے ہوئے

صوفوں پر
لوگوں کے بجائے لفظوں کو
آرام کرتے ہوئے دیکھا
اور بھنے ہوئے پنیر اور چائے کی تواضع میں
دو چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو
آنے والے کی محبت
اور خوشی سے لبریز پایا

وزیر کوٹ کسی جگہ کا نام نہیں
وزیر کوٹ ایک شخص تھا
شخصیت سے اَٹا اَٹ
آنکھوں، سایوں، باتوں اور لفظوں سے بھرا ہوا
جو کسی کو خالی نہیں ہونے دیتا تھا!

(وزیر آغا کی یاد میں)

کہانی اور کتنی دُور جائے گی؟

کہانی ہمارے لیے کبھی نہ ختم ہونے والا راستہ ہے
شام کے مٹیالے اندھیرے میں
جب درخت کسی خلائی مخلوق کی طرح دکھائی دیتے ہیں
تو ہم آگے جانے سے ڈرتے ہیں
اور جب بھاگنے کے لیے پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں
تو یوں لگتا ہے
جیسے کاندھے کسی بوجھ تلے دب رہے ہوں
اور اس قنطور نما بوجھ کے پچھل پاؤں
کہیں دُور داستانی زمانوں میں ٹکے ہوئے ہوں
اور ہم آسیب زدہ ارتقائی بُوزنے
انسانوں کی طرح منمناتے ہوئے سلامتی کی دعائیں مانگنے لگتے ہیں

جب ہم کہانی میں نہیں تھے
تو 'لا کردار' تھے

نہ کوئی ہمارا خدا تھا نہ مذہب
نہ مُلک نہ شہر نہ گاؤں
نہ گھر نہ دیواریں
نہ قوم نہ قبیلہ
نہ حسب نہ نسب
کہانی نے ہمیں کرداروں اور خداؤں میں بانٹ دیا ہے
اب ہم کاغذی زندگی میں اصلی ہونے کی کوشش کرتے ہیں
اور ایک دوسرے کے ساتھ
طفیلیوں کی طرح رہنے پر مجبور ہیں
اور مصنف کے الفاظ اور معانی بھی کھا جاتے ہیں
اور دائمی التوا بلکہ ابتلا میں مبتلا رہتے ہیں

کہانی کار!
ہمیں کچی بستی کے کرداروں کی طرح
بے آسرا مت چھوڑو
وقت نا وقت کی تیز بارشوں میں
کہانی کی دیواریں گر گئی ہیں
اور گھاس پھوس سے بنی ہوئی چھتیں
لگاتار ٹپکنے لگی ہیں
ہم اپنی حدوں سے تجاوز نہیں کرتے

ہم نے چلنا یا اُڑنا کیا، کبھی بادلوں پر پاؤں تک نہیں رکھے
اس کے باوجود ہم جانتے ہیں
ایک دن ہماری کہانی پر بُل ڈوزر پھیر دیا جائے گا
ہمارے گھروں کی طرح
پھر ہم کیا کریں گے؟
اپنے جنازے کہاں لے جائیں گے؟
شہروں کی مٹی ہمارے مُردے قبول نہیں کرتی!

ہم ایک بیضوی گھماؤ میں
چلتے چلتے تھک گئے ہیں
کہانی کار، ہمیں بتاؤ
کہانی اور کتنی دُور جائے گی؟
کیا زندگی سے بڑا بھی کوئی بیانیہ ہے
جسے لکھنے کے لیے
ساری دنیا داؤ پر لگی ہوئی ہے
اس سے پہلے کہ کسی جنت نواز خودکش دھماکے سے
کہانی کے ٹکڑے اُڑ جائیں
ہمیں کہانی سے باہر نکلنے کا راستہ تلاش کر لینا چاہیے!!

(عبداللہ حُسین کے لیے ـــ یہ نظم عبداللہ حُسین کی زندگی میں لکھی گئی تھی)

دیہاتیوں کا گیت

ہم دیہاتی لوگ ہیں
ہمارے خوابوں کے پیٹ کبھی نہیں بھرتے
چاہے ہم زندگی بھر نیند پھانکتے رہیں
شہروں میں تنہا ہوتے ہوئے بھی خوش رہنا
ہمارا المیہ نہیں جینیاتی مجبوری ہے
ہم ملاقاتوں کے اتنے حریص ہوتے ہیں
کہ ملنے والوں کی آنکھیں بھی
بسکٹوں کی طرح چائے میں ڈبو ڈبو کر ہپ کر جاتے ہیں
درخت ہمارے صحنوں اور دِلوں میں،
جھاڑیاں ہمارے جسموں پر
اور فصلی بوٹیاں
دُور دُور تک ہمارے اندر پھیلی ہوتی ہیں
اور آکاس بیلیں

ہماری روحوں سے لپٹی
ہماری ہریالی پر پلتی رہتی ہیں

ہم دیہاتی لوگ ہیں
ہم ہر حال میں زندہ رہتے ہیں
اور موت کے ساتھ جھگڑا کرتے ہوئے
خدا کو عینی گواہ بنا لیتے ہیں
اور عمر بھر ضمانتوں پر ہوتے ہیں
اور گھروں کے دروازے اونچے رکھتے ہیں
تاکہ ہوا سیدھی گزر سکے
اور ہسپتالوں میں جانے سے گھبراتے ہیں
اور میتیں سرد خانوں کے بجائے
برآمدوں اور دالانوں میں رکھتے ہیں
اور ہماری عورتیں
محرابوں اور ستونوں کے ساتھ لگ کر آنسو بہاتی ہیں
اور ناشتوں میں انڈوں اور پراٹھوں کے انبار لگا دیتی ہیں
اور مرنے والوں کی یادیں
ابھاروں کی طرح سینوں سے لگا کر رکھتی ہیں

ہم دیہاتی لوگ ہیں

جہاں ہم ہیں
وہاں آسمان کم اور زمین زیادہ ہے
کھیت، پگڈنڈیاں اور راستے ہیں
ٹبے، کھائیاں، پڑیاں اور ٹھیکریاں ہیں
کیکروں، پھلاہیوں اور بیریوں کی چھدری چھاؤں میں
سمٹ کر سوئی ہوئی دوپہریں ہیں
دائمی انتظار میں حنوط کی ہوئی ملگجی شامیں ہیں
اور اندھیرے میں ٹامک ٹوئیے مارتا بچا کھچا وقت ہے
ہم دیہاتی لوگ ہیں
شام و پگاہ کا تصور ہم سے بہتر کوئی نہیں کر سکتا
رات اگر آنکھوں سے دیکھی جا سکتی
تو ہم سے بینا کون ہے
یہ تو دلوں، دروازوں، دریچوں اور گلیوں سے گزرتی ہے
اور اُساروں پساروں میں پھیل جاتی ہے
اور دن اگر طلوع ہوا ہو
تو ہم عینک کے بغیر بھی اسے دیکھ لیتے ہیں

ہم دیہاتی لوگ ہیں
گاؤں کی دھول اور درختوں کی چھال
ہر جگہ ہمارے ساتھ رہتی ہے

مٹی کا قرض یک مشت ادا ہوتا ہے
اسے قسطوں میں نہیں اتارا جا سکتا
یہ وہ کھاتہ ہے
جس میں جانے کتنے قرنوں کے ڈپازٹس ہیں
صدیوں کے واؤچر ہیں
تہذیبوں کے ورثے ہیں
کتبے اور نسب نامے ہیں
زمان و مکاں کا جمع خرچ ہے
تاریخ کے پنے، مزروعوں کے رجسٹر
اور زمینوں کے لٹھے ہیں
خاندانوں کے خسرے ہیں، کھیوٹ اور کھتونیاں ہیں
مواضع اور پٹوار خانے ہیں
جسموں، روحوں، رشتوں، خوابوں اور یادوں کے بٹوارے ہیں

ہم دیہاتی لوگ ہیں
ہم جانتے ہیں
دھرتی ہم سے اور کچھ نہیں
ہمارے کالبوت واپس مانگتی ہے!

مُفتِ خدا

خوابوں کی مُفت گاہ میں
نُظّار کا ہجوم ہے
تاریخ کے نام پر
قدیم جلوہ گاہوں،
نظریوں، عقیدوں اور فلسفوں کی
خرید و فروحت کُھلے بندوں جاری ہے
غلاموں اور کنیزوں کے ریوڑ ہانکے جا رہے ہیں
آقاؤں، پاشاؤں اور ملکاؤں کے ملبوساتی پیکر
ہر ٹی وی چینل کی اسکرین پر چمک رہے ہیں
قباچوں اور عباؤں کے درمیان
دلوں اور روحوں کی برہنگی پر کوئی قدغن نہیں
میں نہ ہوتے ہوئے بھی ہر کسی کو دکھائی دیتا ہوں
پورے لباس میں

میں چراگاہوں کی گھاس ہوں
نہ بھیڑوں کی اون
میں ہوا کی طرح چلتا ہوں
اور خفیہ کیمروں کی زد میں آئے بغیر گزر جاتا ہوں
تارکول کی سڑکیں میرا کھوج محفوظ نہیں کرتیں
میرے فنگر پرنٹس وقت کی کسی دستاویز پر ثبت نہیں ہوتے
پھر بھی میرے ہاتھ کاٹ دیے جاتے ہیں
میرے جسم کی دیوار
زمین و آسمان کی حدوں سے تجاوز سمجھ کر گرا دی گئی ہے
میری بھوک کاغذی ہے
جو لفظوں کو دیکھ کر چمک اٹھتی ہے
میں قطار میں کھڑا، مفتِ خدا
میری باری آتے آتے
شاعری کی کھرچن بھی ختم ہو جاتی ہے
مجھے کھانے کا ٹوکن نہیں ملتا
میں آخری خواب سے بھوکا لوٹ آتا ہوں!

ریحانے جباری

میں نے قتل کیا ہے
ایک مرد کو
جو میرے جسم میں چھید کرنا چاہتا تھا
نہیں، ایک مرد کی پرچھائیں کو
میں نے قتل کیا ہے
ہاں میں نے قتل کیا ہے
تیز دھار چاقو سے
تا کہ خون بہے
اور بہتا رہے
چوتھی منزل سے
تفتیش گاہ کے تہہ خانے تک
جہاں مجھے کئی بار زندہ مار ڈالا گیا
اور میں نے لکھ دیا

بیانِ حلفی میں
جو انہوں نے کہا
تا کہ باڈوک زندہ رہے
اور کسی اور ٹین ایجر کو چیرا توڑا نہ جا سکے
جیل میں اور عدالت میں
موجود ہونے کے باوجود
خدا مجھے نہیں بچا سکا
خدا انسانوں کے لیے بنائے ہوئے قانون کے ہاتھوں مجبور ہے
آنکھ کے بدلے آنکھ
کان کے بدلے کان
جسم کے بدلے جسم
لیکن پرچھائیں کے بدلے ــــــ
میری، بادلوں کی چھاؤں جیسی،
کم سن روح کو پھانسی دے دی گئی
دیکھو تو، شب ختم ہونے سے قبل
میری صبح دار پر طلوع ہو چکی ہے
میرا بے سایہ جسم اب دھوپ چھاں کا محتاج نہیں رہا
ماں! مجھے دفن مت کرنا
قبروں کے شہر میں
ہوا کو دفن مت کرنا
اور ماتمی لباس پہن کر
رونا مت!
میں بے نشان رہنا
اور بے اشک بہنا چاہتی ہوں
اس زمین پر کوئی جگہ ایسی نہیں
جہاں ہوا، ابر اور آنسوؤں کی قبر بنائی جا سکے
مٹی میرا جوف، میرا اُطاق نہیں
ماں! دروازہ کھول
میرا راستہ ختم ہو گیا ہے!!

باڈوک: ریحانے جباری کی چھوٹی بہن

دُکھ گوتم سے بڑا ہے

دُکھ برگد سے گھنا ہے
دھیان کی اوجھل تا میں
گوتم کو عمر بھر پتا نہ چلا
کہ دُکھ کا انکھوا عورت کی کوکھ سے پھوٹتا ہے
وہ عورت ہی تھی
جس نے اسے جنم دے کر موت کو گلے لگا لیا
اور وہ بھی
جسے وہ بستر میں سوتا چھوڑ آیا تھا
عورت تھی
اور حالتِ مرگ میں اُسے
دودھ اور چاول کی بھینٹ دینے والی بھی ایک عورت تھی
وہ، کپل وستو کا شہزادہ
دو پہیوں پر چلتی بیل گاڑی

اور گاڑی وان کو دکھ سمجھتا رہا
اور بڑھاپے، بیماری اور موت پر
قابو پانے کی کوشش کرتا رہا
لیکن اتنا نہ جان سکا
کہ گیان دھیان انچاس دنوں کا نہیں
ساری عمر پر محیط ہوتا ہے
اور عرفان و آگہی کا دریا
حقیقی زندگی کے کناروں سے پھوٹتا ہے

گوتم نے غزہ نہیں دیکھا
وہ عراق، افغانستان اور شام نہیں گیا
اُس نے تو کراچی اور کوئٹہ بھی نہیں دیکھے
بوری بند لاشیں
اور خودکش دھماکوں میں اُڑتے ہوئے
انسانی اعضا نہیں دیکھے
بحرِ متوسط کے ساحل پر اوندھے پڑے ہوئے ایلان کردی
اور دریائے ناف کے کنارے
کیچڑ میں لت پت شوحیات کو نہیں دیکھا
افریقہ میں دودھ سے عاری ڈھلکی ہوئی سیاہ رنگ چھاتیاں
اور مرتے ہوئے آبنوسی ڈھانچے نہیں دیکھے

گوتم نے عظیم جنگیں
اور آبدوزوں میں مرنے والوں کی آبی قبریں نہیں دیکھیں

گوتم نے مارکسی ادب نہیں پڑھا
وہ پانچ اور سات ستارہ ہوٹلوں کا دربان بھی نہیں رہا
ورنہ نروان کے لیے کبھی فاقے نہ کرتا
آج گوتم اگر زندہ ہوتا
تو دُکھ کا انتم سرا کھوجتے ہوئے
واڈکا پی کر
کسی غیر ملکی محبوبہ کے نیم برہنہ پہلو میں
شانتی کی نیند سو رہا ہوتا!

شہر کا آخری عام آدمی

رشید امجد!
تم سے مِلنا درخت سے مِلنے جیسا ہے
جس طرح درخت ہر آنے والے کے لیے
اپنی شاخیں کھول دیتا ہے
اور چھاؤں پھیلا دیتا ہے
اسی طرح تم ہر ملنے والے کے لیے
اپنی باہیں وا کر دیتے ہو
اور اُسے باتوں کے "غابے" میں یوں سمیٹ لیتے ہو
جیسے تمہاری شانتی بھری جنگلتا اُسی کی منتظر تھی
ڈرائنگ روم اُس کی خاموشی
اور تمہاری آواز سے بھر جاتا ہے
حسبِ موسم
آتشدان اور ایئر کنڈیشنڈ خود بخود اپنا کام کرنے لگتے ہیں

اور لائٹ کا بٹن آن ہوتے ہی
دروازوں اور کھڑکیوں کے پردوں پر
گلیاں اور محلے آباد ہو جاتے ہیں
سڑکیں اُبھر آتی ہیں
سانسوں کی رکی ہوئی ٹریفک چلنے لگتی ہے
تمہارے اندر بسا ہُوا پرانا شہر
فوراً باہر نکل کر
قالیچہ زدہ فرش کی خالی جگہوں پر پَسر جاتا ہے
یہاں تک کہ بے تکلفی سے
صوفوں اور کرسیوں کے بازوؤں پر چڑھ جاتا ہے
اور اُس وقت تک بیٹھا رہتا ہے
جب تک ملاقی چلا نہ جائے
کتاب خوروں کے لیے
تمہاری لائبریری کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا ہے
تمہارے لفظوں کے طویلے میں
علامتوں کے غاشیہ بردار
قرطاسی گھوڑوں کی زینیں کسنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں

رشید امجد!
تم علم بانٹتے اور ادب چھانتے ہو

حقیقتوں کو افسانے اور افسانوں کو حقیقتیں بناتے ہو
زمان و مکان کا جغرافیہ
اور تاریخ کا مستقبل لکھتے ہو
نوکِ قلم سے نکلے ہوئے ایک نقطے میں
کائنات کی دھڑکن بھر دیتے ہو
لیکن خود آفرینش سے اب تک
ایک نادیدہ مرشد کی انگلی پکڑے
راستوں کے ڈھیر پر کھڑے کھڑے چلے جا رہے ہو
جو ہر روز تمہیں تمہارے ہی گھر کے دروازے پر چھوڑ کر
اپنے آپ میں تحلیل ہو جاتا ہے
سچ بتاؤ! مرشد کے چغے میں
تم خود ہو یا کوئی اور؟
اصل میں تو ہر اچھا لکھاری اپنا مرشد آپ ہوتا ہے
لیکن تم شاید بتانا نہیں چاہتے
اور گُلِ حکمت کی طرح
یہ راز اپنے سینے ہی میں سوختہ رکھنا چاہتے ہو
اسی لیے باتیں کرتے ہوئے اتنے زور سے مسکراتے ہو
کہ تمہارے پیچھے کھڑا
ایک نظر نہ آنے والا مرشدی سایہ چونک اٹھتا ہے
اور معصومیت کے مارے صاف دکھائی دینے لگتا ہے

رشید امجد!
جب سے دنیا دو تہذیبوں میں تقسیم ہوئی ہے
شہر میں طبقوں اور علاقوں کی لکیریں کھینچ دی گئی ہیں
بیٹھنے اور گھومنے کی جگہوں پر
خاردار تاروں کے لچھے پھیلا دیے گئے ہیں
سڑکیں متبادل راستوں میں بٹ گئی ہیں
اور یوٹرن میلوں دُور چلے گئے ہیں
آموزش گاہوں کے چوگرد فصیلیں اٹھا دی گئی ہیں
بلیک بورڈ پر لکھنے والے ہاتھوں سے
چاک لے کر پستول تھما دیے گئے ہیں
آپا دھاپی کے عالم میں
تخلیق کار تخلیق کی بجائے
جیتے جی بزورِ بازو اپنی تاریخ لکھنے اور لکھوانے میں لگ گئے ہیں
اور مرشد کا کچھ پتہ نہیں کہاں غائب ہے
عالمِ ابر و باد میں ہے
یا کسی دھوپ کھائے، پیڑ مارے پارک میں
درد خوردہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھے
لائیو مراقبے کی ریہرسل کر رہا ہے
یا کسی نو تعمیر شدہ انڈر پاس سے گزرتے ہوئے
ترقی کی رفتار دیکھ کر خوش ہو رہا ہے

سُنا ہے اس نے تمہارے ساتھ واک پر جانا بھی چھوڑ دیا ہے
اور فزیوتھراپسٹ کے انتظار میں
جہاں تم بیٹھتے ہو
وہیں لاتعلق سا، صوفے پر نیم خواب، نیم تاب پڑا رہتا ہے

رشید امجد!
آئس ایج سے سائبر ایج تک
خط آنے تو کب کے بند ہو چکے ہیں
ٹی سی ایس والا بھی ہفتوں کوئی پیکٹ دیے بغیر گزر جاتا ہے
اِس صورتِ حال میں
مرشد نے مشکل سے ای میل کرنا سیکھا تھا
اور فیس بک پر بغیر تصویر کے پروفائل بنایا تھا
کہ اس کی آئی ڈی ہیک ہو گئی
کسی کو نہیں معلوم
مرشد میل ہے یا فیمیل
اب شہر میں عالمِ غیب کے باسیوں کی جنس
تمہارے علاوہ کوئی نہیں جانتا
سب ایک ذوجنسی روحانیت کے لبادے میں
دُنیا داری کی دھمال ڈال رہے ہیں
اور محبت محبت کھیل رہے ہیں

رشید امجد!

تم بے زار آدم کے بیٹے تھے

اس لیے ریت پر گرفت نہ رکھ پائے

اور کسی سہ پہر کی خزاں

پت جھڑ میں خود کلامی کرتے ہوئے

بھاگ ہے بیاباں مجھ سے کا اعتراف کر بیٹھے

اور عام آدمی کے خواب دیکھنے لگے

کاغذ کی فصیل پر

عکسِ بے خیال بناتے ہوئے

گمشدہ آواز کی دستک میں کھو گئے

اور دشتِ خواب سے

ست رنگے پرندے کے تعاقب میں

ایک ایسے امارت کدے کی طرف نکل گئے

کہ صحرا کہیں جسے

رشید امجد!

جب شہر میں اور دلوں میں مارشل لا لگتا ہے

تو آوازیں اور دھڑکنیں خاموش ہو جاتی ہیں

اور سناٹا بولتا ہے

خبریں کہانیوں میں ،

کہانیاں علامتوں اور استعاروں میں

اور کردار فلمی اداکاروں اور تصویروں میں بدل جاتے ہیں

رشید امجد! زندگی عجیب مخمصہ ہے

ہمیں مرنے سے نہیں مارے جانے سے ڈر لگتا ہے

تم ہی بتاؤ!

مادرِ رحم میں وہ جنین

جنہیں ربڑ کی نہیں اصلی گولیاں لگی تھیں

شہید ہیں یا غازی؟

وہ تو پیدا ہی نہیں ہوئے تھے

اُن بچوں کی طرح

جو گٹر میں بہا دیے گئے

اور جو پیدا نہیں ہوئے وہ مر کیسے گئے؟

اور جو مرے نہیں شہید کیسے ہو گئے؟

اور جو شہید نہیں ہوئے وہ غازی نہیں تو کیا ہیں؟

کتنے سُکھی ہیں وہ بچے

جو تمہارے افسانوں میں

پیدا ہونے سے پہلے، مَرے بغیر مَر گئے

رشید امجد!

گملے میں اگا ہُوا شہر

مٹی کو آخر کار مٹی میں پناہ ملتی ہے
آسمان اسے قبول نہیں کرتا
آسمان پر روحیں ہوتی ہیں
جسم نہیں
اور شاعری کے لیے
جسم ضروری ہے
شاعری فرشتوں پر نہیں انسانوں پر اترتی ہے!

رُوح کے پاؤں نہیں ہوتے

رُوح جب کسی جسم کو اوڑھتی ہے
تو اُس کے کپڑوں اور جوتوں کا سائز نہیں پوچھتی
اُس کا رنگ اور حسب نسب بھی نہیں دیکھتی
اور نہ دیگر اعضا کی کارکردگی ـــــــ
وہ دیکھتی ہے
کہ اس جسم میں کتنا پیار ہے
اس کی بیالوجی میں کتنی محبت ہے
کتنا نمک اور کتنا گلوکوز ہے
اس کے دل میں
کتنے سمندروں کی گہرائی ہے
اور آنکھوں میں
کتنے آسمانوں کی وسعت ہے،

کتنے بادل سما سکتے ہیں
اور بارشوں کے کتنے موسم ہیں
اور اس جسم میں ہوا داری کے کتنے راستے ہیں
کتنے دروازے، کتنی بالکونیاں ہیں
اور آنے جانے کے لیے
اس کے آر پار کتنی آسانی سے گزرا جا سکتا ہے
رُوح بادلوں کی طرح بے آواز چلتی ہے
رُوح کے پاؤں نہیں ہوتے!

میں کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کر سکتا

بیٹھے بٹھائے
بادلوں اور ہواؤں کے ساتھ چل پڑتا ہوں
اچھی بھلی دھوپ کے ہوتے ہوئے
بارشوں میں بھیگنے لگتا ہوں
بچوں کے ساتھ بچہ بن جاتا ہوں
اور ہنسی کھیل میں
رونے لگتا ہوں
اور سمندر آنکھوں کی بجائے جیبوں میں بھر لیتا ہوں
جانتے بوجھتے
عورتوں سے سچی محبت کرنے لگتا ہوں
دوستوں کے ایک میسج پر
خوامخواہ دروازہ کھول کر بیٹھ جاتا ہوں

دعوتوں میں
وقت سے پہلے پہنچ کر
میزبانوں کا استقبال کرتا ہوں
نئے کپڑوں پر سالن گرا دیتا ہوں
تصویریں بنواتے ہوئے
فوکس سے ہٹ کر ایک طرف بیٹھ رہتا ہوں
یا دوسروں کے لیے جگہ بناتے بناتے
خود فریم سے باہر ہو جاتا ہوں
دھکا پیل سے آگے بڑھنے کے بجائے
قطار میں اپنی باری کا انتظار کرتا ہوں
جو اکثر آئے بغیر گزر جاتی ہے
دورانِ گفتگو
مخاطب کا ایک لفظ سُن کر ساری بات سمجھ جاتا ہوں
اور بات پُوری ہونے سے پہلے بول پڑتا ہوں
چائے کی پیالی سامنے رکھ کر پینا
اور اپنی تعریف کرنے والے کی
تعریف کرنا بھول جاتا ہوں
اور تو اور شیو کرتے ہُوئے
نظم لکھنے لگتا ہوں!

آبائی گھروں کے دُکھ

آبائی گھر ایک سے ہوتے ہیں
ڈیوڑھیوں، دالانوں، برآمدوں، کمروں اور رسوئیوں میں بٹے ہوئے
لیکن ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے
آبائی گھروں میں
گھِسی ہوئی سرخ اینٹوں کے فرش
اور چُونا گچ نم خوردہ دیواریں
بے تحاشا بڑھی ہوئی بیلیں
چھتوں پر اُگی ہوئی لمبی گھاس
اور املی اور املتاس کے درخت
ایک دائمی سوگواریت لیے ہوئے
ایک ہی جانب خاموشی سے دیکھتے رہتے ہیں

آبائی گھروں کے اندر چیزیں بھی ایک سی ہوتی ہیں

پڑچھتیوں پر پیتل اور تانبے کے برتن
گرد جھاڑنے، قلعی کرنے والے ہاتھوں کا انتظار کرتے ہیں
چنیوٹ کا فرنیچر
اور گجرات کی پیالیاں اور چینکیں
خالی پڑی رہتی ہیں
کھونٹیوں پر لٹکے ہوئے کپڑے اور برساتیاں
اترنے کی منتظر رہتی ہیں
اور چہل قدمی کی چھڑیاں اور کھونڈیاں
سہارا لینے والے ہاتھوں کو ڈھونڈتی ہیں
فریم کیے ہوئے شجرے،
بلیک اینڈ وائٹ اور سیپیا تصویریں
اور طاقوں میں رکھی ہوئی مقدس کتابیں
اور کامریڈی دور کا مارکسی ادب
سب کچھ اپنی اپنی جگہ پڑا ہوتا ہے

آبائی گھروں کے مکین بھی ایک سے ہوتے ہیں
بیرونی دروازوں پر نظریں جمائے، آخری نمبر کا چشمہ لگائے
بینائی سے تقریباً محروم مائیں
اور رعشہ زدہ ہاتھوں والے باپ
اور اپنے تئیں کسی عظیم مقصد کے لیے جان دینے والوں کی بیوائیں

جو کبھی جوان اور پُر جوش رہی ہوں گی
آبائی گھروں میں لوگ نہیں ساعتیں اور صدیاں بیمار ہوتی ہیں
زمانے کھانستے ہیں
آبائی گھر لوٹ آنے کے وعدوں پر
باوفا دیہاتی محبوبہ کی طرح سدا اعتبار کرتے ہیں
اور کبھی واپس نہ آنے والوں کے لیے
دل اور دروازے کھُلے رکھتے ہیں

شاعروں کے لیے
آبائی گلیوں کی دوپہروں
اور پچھواڑے کے باغوں سے بڑا رومانس کیا ہو سکتا ہے
جہاں تتلیاں پروں کا توازن برقرار نہیں رکھ سکتیں
اور پھولوں اور پتوں پر کریش لینڈنگ کرتی ہیں
اور دھوپ اور بارش کے بغیر
قوسِ قزح جیسی ہنسی بکھرتی ہے
اور نسائم جیسی لڑکیاں سات رنگوں کی گنتی بھول جاتی ہیں
آبائی گھروں میں
وقت بوڑھا نہیں ہوتا
دراصل ہم بچے نہیں رہتے
اور کھلونوں کے بجائے اصلی کاریں چلانے لگتے ہیں

اور کبھی کبھی اصلی گنیں بھی ——

آبائی گھروں کو جانے والے راستے بھی ایک سے ہوتے ہیں
سنسان اور گرد آلود
مسافروں سے تہی
جن پر بگولے اڑتے ہیں
یا میّت اُٹھائے کبھی کبھی کوئی ایمبولینس گزرتی ہے
پھلاہی اور کیکروں سے ڈھکے آبائی قبرستان
تھوڑی دیر کے لیے آباد ہوتے ہیں
اور پھر دُعاؤں اور باتوں کی بھن بھن میں
منظر تتر بتر ہو جاتا ہے
یہاں تک کہ موسم سے اکتائے ہوئے
بادل بھی کسی پہاڑی قصبے کی طرف چلے جاتے ہیں
آبائی راستوں کے دکھ نظمائے نہیں جا سکتے
انہیں یاد کرتے ہوئے رویا بھی نہیں جا سکتا
یہ صرف کسی اپنے جیسے کے ساتھ شیئر کیے جا سکتے ہیں

عمریں گزر جاتی ہیں
شہروں میں اور ملکوں میں
لکڑی کے صندوق اور پیٹیاں ہماری جان نہیں چھوڑتیں

گھروں میں کوئی جگہ نہ ہو
تو دلوں اور ذہنوں کے کباڑ خانوں میں رکھی رہتی ہیں
کبھی نہ کھلنے کے لیے
اور پھر ایک دن ہم خود بند ہو جاتے ہیں
زمین پر آخری دن آنے سے پہلے
ہمارے دن پورے ہو جاتے ہیں!!

(ابرار احمد کے لیے)

میں دریا ہوں، میرے ساتھ چلو

کنارو! کھڑے کھڑے کیا دیکھتے ہو
میرے ساتھ چلو
صدیوں کا ٹھہراؤ میرے سنگ بہتا ہے
تم بھی چلو
میرے پیدائشی ساتھیو
تم وہ جڑواں ہو
جو کبھی ایک دوسرے سے نہیں مِلے
تم سمجھتے ہو کہ میری وجہ سے!
کتنا غلط سوچتے ہو
اے ایک دوسرے کو دُور دُور سے دیکھنے والو!
یہ میں ہی ہوں
جو تمہارے دوار آئے
دُور دراز کے مسافروں کو باہم ملاتا ہوں

اور کشتیوں کو آر پار گزرنے دیتا ہوں
کس سَفّاکی سے وہ میرا سینہ چیرتی ہیں
آؤ میری لہروں سے اپنے مٹیالے، ریتیلے جسم رگڑو
میری گیلا ہٹوں اور نرماہٹوں سے
پُرلطف زمانوں کا ادراک کرو
میرا لمس ہر چھونے والے وجود کے لیے یکساں ہے
میں دائیں اور بائیں کی تخصیص نہیں رکھتا

آؤ میرے ساتھ چلو!
میں شہروں اور مُلکوں سے گزرتا ہوں
سرحدیں میرا راستہ نہیں روکتیں
میرے پانیوں سے محبت کی داستانیں جنم لیتی ہیں
کتنے پُل میرے اوپر قائم ہیں
عقیدے مجھ میں اشنان کرتے ہیں
تہذیبیں میرے مرنے پر خودکشی کر لیتی ہیں
میں جغرافیے کا امین
اور تاریخ کا چشم دید گواہ ہوں
جلی ہوئی کتابوں، کٹی ہوئی لاشوں
اور آبادیوں کی ساری کیچڑ سے اَٹ کر بھی چلتا رہتا ہوں
بہت بھر جاؤں

تو شاعروں کی آنکھوں اور نظموں سے رسنے لگتا ہوں
میں زندہ آثارِ قدیمہ ہوں
میں سندھو ہوں، ڈینیوب ہوں
لیکن جب دجلہ و فرات میں ڈھلتا ہوں
تو پیاس کا عظیم استعارہ بن جاتا ہوں
میرا کوئی ایک نام نہیں
میں وقت کا سیال سیاح ہوں
اور سنگلاخ سرزمینوں پر نت نئے ناموں سے سفر کرتا ہوں
رکنا میری موت ہے
مجھے کسی میوزیم میں محفوظ
اور کسی یادگاری چیز میں مجسم نہیں کیا جا سکتا
میری تہہ میں چھپے دکھوں کی بازگشتیں
ہواؤں کی طرح خاموش راستوں میں سنائی دیتی ہیں
اور میرے گیتوں کی صدائیں
قدیمی مقادِس کی محراب دار غلام گردشوں میں
اور پشمینہ پوشوں، صومعہ نشینوں کے دلوں میں گونجتی ہیں

اے میری حفاظت پر معمور دائمی ساتھیو!
آرام سے میرے ساتھ چلو
مجھے کسی سے کوئی خطرہ نہیں

سوائے لگاتار تیز بارشوں کے
جو کبھی کبھی مجھے غصہ سے لبالب کر دیتی ہیں
اور میں تمہارا حفاظتی حصار توڑ کر
بستیوں، کھیتوں، چراگاہوں
اور ہموار نشیبی علاقوں کی طرف جا نکلتا ہوں
تمہارے ساتھ انہیں بھی ڈبو دیتا ہوں
لیکن دھوپ نکلتے ہی
اپنے راستے پر واپس آ جاتا ہوں
اور تم پھر سے مجھے گھیرے میں لے لیتے ہو
عظیم بہادرو! مجھے تمہاری وفاداری پر کوئی شک نہیں
تم کٹ کر بھی مجھ میں گرتے ہو

ہم گردو!
میں ہمیشہ بلند و بالا شاداب پہاڑوں،
سوکھی چمڑی والی بوڑھی مرتفع سطحوں،
گھنے جنگلوں، میدانوں
اور ریتلے صحراؤں سے ہوتا ہوا
کھارے سمندر سے جا ملتا ہوں
جہاں بھیگی ہوئی نمکین ہوائیں میرا استقبال کرتی ہیں
اور میرے پانیوں کی مٹھاس

جھاگ آلود کسیلی کڑواہٹ میں بدل جاتی ہے
اور تم دو ازلی جدائی زدہ، سدا کے فراقیے
مجھے وصالِ بحر میں چھوڑ کر
ایک مستقل الوداعی پوز میں استادہ ہو جاتے ہو

لیکن اب میں دیکھ رہا ہوں
عہد بہ عہد، سال بہ سال
میری آبی سطح گر رہی ہے
اور میرا گلوکوز لیول خطرناک حد تک کم ہوتا جا رہا ہے
بہتے بہتے میرا بہاؤ ہانپنے لگتا ہے
اور میں سمندر تک پہنچنے سے پہلے ہی سوکھنے لگا ہوں
اور کہیں کہیں تو
بڑھتی ہوئی کروی حرارت نے
مجھے زیرِ زمین جانے پر مجبور کر دیا ہے
اور تم بھی
ملاحوں، مچھیروں اور مچھلیوں کی فکرت میں
روز بروز مجھ سے پیچھے ہٹتے جا رہے ہو

آب نشینو! میرا راستہ بھی عجیب ہے
ہمیشہ اُوپر سے نیچے کی طرف

سُرمئی نیند کی بازگشت

کاش میں کبھی آسمان کی طرف جا سکتا
تو بادلوں میں سے گزرتے ہوئے
ست رنگی کمان بن جاتا
میرے ساتھ تم بھی رنگوں میں لتھڑ جاتے
بادلوں سے آگے، اور آگے
لاجوردی خلاؤں سے گزر کر
شاید ہم کسی ایسی دنیا میں پہنچ جاتے
جہاں اتنی آلودگی، اتنی گھٹن نہ ہوتی
جہاں یہ نسا جال نہ ہوتا
جہاں تم کھل کر سانس لے سکتے
اور میں بھی آسانی سے
رواں رہتا
اور وقت کی طرح
سدا بہتا!!

بوڑھوں کا گیت

عورتو آؤ!
ہم بوڑھے لوگوں سے محبت کرو
آؤ ہم سے محبت کرو
ہم تمہاری جوانی کا ابدی گیت ہیں
روشن دنوں کی دائمی دعا ہیں
ہم سے بہتر کوئی تمہاری ثنا نہیں کر سکتا
ہمارے سفید بالوں، پکی رنگت
اور جھریائے ہوئے چہروں پر نہ جاؤ
ہماری دل گرمی، دل گدازی دیکھو
ہم لفظوں کی پلپلاہٹ ہیں
تمہاری غیبی کہانیوں میں
بچ رہنے والے آخری حقیقی کردار

اور تمہاری زندگیوں کے سب سے خوبصورت کنائے ہیں

عورتو آؤ، ہمارے پاس بیٹھو
ہم سے باتیں کرو
ہم تمہاری ناآسودہ محبتوں کا بھرم ہیں
ہم تمہاری سہیلیاں ہیں
آؤ ہمارے ساتھ پیدل چلو
ہماری قربت کو محسوس کرو
اور ہمارا ہاتھ تھامتے ہوئے ڈرو مت
ہمارا خاموش کہنہ لمس
تمہاری ہی خواہشوں کا خمیازہ ہے
ہماری انگلیاں جادو کی چھڑیاں ہیں
جو رنگ برنگے لباسوں کو پرندوں میں بدل سکتی ہیں
ہم نے زمانوں کے سرکس دیکھے ہیں
موت کے کنوؤں کے چکر لگائے ہیں
اور وقت کے شیروں کو سدھایا ہے
ہمارے سینوں کے راز کرید دو
ہمارے ساتھ دُور کے اسفار پر نکلو
ہم آج بھی راستوں کے اطراف میں
پُھول کِھلا سکتے ہیں

فصلیں اور درخت اُگا سکتے ہیں
کھنگریلے پتھروں پر بیٹھ کر
بادلوں اور ہواؤں سے باتیں کر سکتے ہیں
اور پَل کے پَل بارش لا سکتے ہیں

نیک دل عورتو آؤ!
ہماری آنکھوں کے بے بہا پانیوں میں اترو
ہم سمندر ہیں
ہمارے ریتلے ساحلوں پر
ننگے پاؤں چہل قدمی کرو
دیکھو ہماری ریت کتنی نرم ہے
ہمارے جزیروں کی رات خالص ہے
اور صبح اجلی ہے
ہمارے وجود کے جنگلوں میں
برگدی معبد ہیں
مقدس روشنی ہے
نروان ہے
اس سے پہلے
کہ ہماری دھوپ چھاؤں معدوم ہو جائے
اور ہم عمروں کی طویل راہگزاروں پر

اُٹھتے بیٹھتے، پاؤں گھسیٹتے
جیتے جاگتے پرچھائیوں میں ڈھل جائیں،
اپنے طلسم بند جسموں پر
ہماری فتح کے طول و ارض تسلیم کرو!
ہم سے محبت کرو!!
ہماری تکریم کرو!!!

بچپن کی سماعتیں بڑی تیز ہوتی ہیں

شکر دوپہروں میں
کوئلوں سے دیواروں پر
کھڑکیوں اور دروازوں کی شکلیں بناتے ہوئے
حملہ آور گالیوں کی طرح
اچانک امنڈ آنے والا
گلیوں کا سناٹا ہو
یا دالانوں میں گھٹتی
ننگ دھڑنگ طفلانہ خاموشی ——
نیم تاریک پساروں میں
دکھائی نہ دینے والے جسموں کی
دبی دبی ہنسی آلود باتیں ہوں
یا رسوئیوں اور برآمدوں میں چلتی پھرتی

نئی نئی سہاگنوں کی ذائقے دار سرگوشیاں ——
اُڑتے ہوئے پرندوں کی
گھونسلوں میں رہ جانے والی پروازیں ہوں
یا آسمان کی گونجیلی نیلاہٹوں میں
بے آواز پروں کی
ہلکورے لیتی، لہریے بناتی
پھڑ پھڑاہٹیں ——
گِلہریوں کے رینگنے کی سرسراہٹ ہو
یا بارش میں نہاتے ہوئے
قدموں کی شپ شپ ——
درختوں کی شاخیں کٹتے ہوئے
پتوں اور تتلیوں کی سسکیاں ہوں
یا جنگلوں، راستوں اور پہاڑی درّوں سے گزرتی ہوئی
ہوا کی کلکاریاں ——
سرحدوں کے آر پار بنے
اونچے بنکروں سے برستی تڑ تڑ گولیاں ہوں
یا نشیبی رات کا سینہ چیرتی
پہرے داروں کی سیٹیاں ——
بچپن کی سُنی ہوئی آوازیں
عمر بھر سنائی دیتی ہیں!

فلیش بیک سے باہر

وہ تم تھے
جو زمان و مکاں کی حدیں توڑ کر
دینہ سے مِلنے آئے تھے
میں تو یونہی وہاں جا پہنچا تھا
ڈھلتی سہ پہر کے سرمئی سایوں کی طرح
ایک سے دوسری جگہ
دن گزاری کے لیے
کہ اچانک وقت میری گرفت میں آ گیا
ریلوے اسٹیشن سے باہر
ایک سفید سائے سے گلے مِلتے ہوئے
یوں لگا جیسے
دھوپ اور بارش کو ایک ساتھ چھو لیا ہو
جیسے دن کے تیسرے پہر کے مٹیالے پَن میں

چاندنی اوڑھ لی ہو
پتا نہیں تمہارے ہاتھ میں ٹائم مشین تھی یا کیا تھا
زمانے پیچھے کی طرف چل پڑے تھے
تم ننھے سے جیوڑے
ریل کی فولادی پٹڑی کے پاس
کوکتی، چھینکتی، ہانپتی، سانسوں کی دبیز بھاپ نکالتی
ریل گاڑی کو دیکھ رہے تھے
اور میں بستہ لیے
ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر
پرانے چوبی بینچ پہ بیٹھا
مال گاڑی کے ڈبے گن رہا تھا
کھاریاں اور دینہ ایک ہی محور پر گھوم رہے تھے
اور کسی کو خبر نہیں تھی
کہ وقت سے بھاگے ہوئے
ہم دونوں اُس وقت کہاں تھے
ہماری فینٹاسیہ ایک، عینیت ایک تھی
لیکن زمانے اور قصبے الگ الگ
اور اب تو ملک بھی الگ الگ ہیں
اور دنیائیں بھی
تم شہرت کے بوجھ تلے دبے ہوئے

اور میں گمنامی کا مارا ہُوا
لیکن ہماری مونچھوں اور ہنسی کا رنگ ایک جیسا ہے
روشن اور سفید ـــــــ

ماضی کی ایک تنگ گلی میں کھڑے
چم چم اور گلاب جامن کھاتے ہوئے
تم لوگوں سے یوں مِل رہے تھے
جیسے سب تمہارے ہم جوار و ہم جولی ہوں
اور گلی جیسے تمہارے ہی گھر کا حصہ ہو
بچپن کے گھر میں داخل ہونے کے لیے
جیسے تم میرے ہی منتظر تھے
اور جب میرا بازو پکڑے ہوئے
تم دروازے سے گزر رہے تھے
تو تمہارے پاؤں جیسے سدِ صوت کو پار کر رہے تھے
تمہاری خاموشی کی آواز گمبھیر ہو گئی تھی
اور نیم تاریک صحن میں
کسی بڑی عمر کی لڑکی کو نہ پا کر
جیسے تمہارے خوابوں کی گولک ٹوٹ گئی تھی
اور عمروں کی جمع ریزگاری
وہیں پڑی رہنے کے لیے بکھر گئی تھی

اور تمہاری آنکھوں میں
جہلم کا کوئی سیلابی ریلا امنڈ آیا تھا

فلمی لوگوں کو
یہی تو سہولت ہے
کہ جب چیزیں حد سے
اور جذبات بس سے باہر ہو جائیں
تو فوراً سین "کٹ" کر کے
اپنی مرضی کے مطابق دوبارہ شوٹ کر لیتے ہیں
دیکھتے ہی دیکھتے
تم نے اسکول میں داخلہ لیا
حاضری لگوائی
سبق یاد کیا
اور یک دم فلیش بیک سے باہر نکل کر
اپنے نام سے منسوب کالرہ بلاک کے سامنے آ کھڑے ہوئے
دوسری ہجرت کے لیے
فلم بنتی رہی
فوٹو سیشن ہوتے رہے
اور میں فوکس سے باہر واحد تماشائی
منظر کے ایک سرے پر بیٹھا

تمہیں اساتذہ کے جھرمٹ میں
بچوں کی طرح
تاریخ اور جغرافیے کا رٹا لگاتے دیکھتا رہا
جانے کب تک زمانوں کا آموختہ آمیخت ہوتا رہا
جانے کب تک پنسل اور ربر سے
لکیریں بنتی اور مٹتی رہیں
یہاں تک کہ ایک بار پھر سین کٹ ہوا
اور تم گولی کی سی تیزی سے سرحد کی طرف چل پڑے

میں نے پہلی بار تمہیں جلدی میں دیکھا
ورنہ تم تو جہاں رکتے تھے
وہیں کے ہو جاتے تھے
جیسے ہر دل تمہارے آبائی وطن کا احاطہ ہو
وہ کیا تھا جو مجھے معلوم ہوتے ہوئے بھی معلوم نہیں تھا
جو تم جانتے ہوئے بھی بتانا نہیں چاہتے تھے
آنے میں اتنا ٹھہراؤ
کہ بار بار گلے ملتے تھے
اور گال سے گال مَس کرتے تھے
اور جانے میں اِتنی عجلت
کہ سین او کے ہوئے بغیر پیک اپ کر دیا

ساگ اور مکئی کی روٹی
جس کی اشتہا
تمہاری غزلوں، نظموں اور تمہارے گیتوں سے ٹپکتی تھی
اور گڑ کی بھیلی
جسے چکھنے کے لیے
تم نے جنم جگ انتظار کیا
کھانے کی میز پر دھری رہ گئی

ناگاہ موبائل فون کی گھنٹی بجی
اور کہیں آدھے رستے کی دوری سے
کوئی الوداعی آواز سنائی دی
"ناصر صاحب، ناصر صاحب"
پتا نہیں وہ تم تھے
جو تھوڑی دیر پہلے پاکستان کے دینہ کے باسی تھے
یا ہندوستان کے شہری، بالی وڈ کے گلزارؔ ـــــــ!

(گلزارؔ کے لیے)

"ہم سب" خواب دیکھتے ہیں

جب ہم خواب دیکھتے ہیں
تو ہماری نیند اغوا کر لی جاتی ہے
اور رات بھر تشدد کے بعد
اندھیرے کی بوری بند لاش
زمین کے قریبی 'بلیک ہول' میں پھینک دی جاتی ہے
اور کائنات کے بے آواز 'سوناٹے' میں
صبح کی چیخ طویل اور نامختتم ہو جاتی ہے
اور دن بھر دھوپ اور چھاؤں کی مشقت میں
خدا کا مذہب سکھایا جاتا ہے
یہ جانتے ہوئے بھی
کہ انسان جبلی طور پر خدا کا 'ہم مذہب' ہے
اور ہم ایک آسمانی ٹرانس میں

نقطہ بھر زمین پر ماند و بود کے نغمے چھیڑتے ہیں

جب ہم خواب دیکھتے ہیں
تو سورج کے ارد گرد دیواریں اونچی ہونے لگتی ہیں
اور یوٹیلٹی بلز ادا کرنے والوں کی قطاریں
معمول سے لمبی ہو جاتی ہیں
کچہریوں میں اسٹامپ فروشوں کے تھڑوں کے پاس
کھڑے ہونے کی جگہیں نہیں رہتیں
اور حلفیہ بیانات کی تصدیق کے لیے
خدا کے بجائے نوٹری پبلک کے گرد بھیڑ لگ جاتی ہے
اور عدالتیں تا حکم ثانی برخاست ہو جاتی ہیں
یہاں تک کہ اگلی پیشیوں کا وقت آ جاتا ہے

جب ہم خواب دیکھتے ہیں
تو ٹی وی چینلز سے رت جگوں کی خبریں نشر کی جاتی ہیں
اور نیندوں میں برہنہ چلنے کے مناظر دکھائے
اور بے خوابیوں کے اشتہار چلائے جاتے ہیں
جنہیں لگا تار دیکھنے سے
ہماری آنکھوں میں موتیے کے پھول کھل اٹھتے ہیں
اور لوڈ شیڈنگ کے دورانیے میں

اندھیرے کا آرکسٹرا بجتا رہتا ہے
اور آپریشن تھیٹرز میں
لیزر کی شعاعیں ہماری آنکھوں کے ڈھیلوں میں چھید کرتی ہیں
اور خوردبینیں ہمارے جسموں کے خفیہ مقامات دیکھ لیتی ہیں

جب ہم خواب دیکھتے ہیں
تو سینٹ کا اجلاس وقت سے پہلے شروع ہو جاتا ہے
اور اسمبلی کی کارروائی خلافِ معمول اُردو میں ہونے لگتی ہے
اور فلمی اداکارائیں فر فر انگریزی بولتی ہیں
اور سڑکوں پر لگے ناکے
استقبالی کیمپوں میں بدل جاتے ہیں
اور پولیس مقابلوں میں
سچ مچ کے ڈاکو مرنا شروع ہو جاتے ہیں

جب ہم خواب دیکھتے ہیں
تو راتوں رات ٹیکسوں میں اضافہ ہو جاتا ہے
اور مارکیٹ اکانومی کے اصولوں کے عین مطابق
قیمتوں میں رعایت واپس لے لی جاتی ہے
اور چوہے مار گولیوں کی قیمت دگنی کر دی جاتی ہے
کتابوں کی دکانوں کی جگہ بیوٹی شاپس کھل جاتی ہیں

بے تاریخ عمارتوں
اور انسانوں سے لبالب شہروں میں
میٹرو اور رنگ برنگی سُپر ٹرینیں دوڑنے لگتی ہیں
اور تھری ڈی فلموں کے لیے
مہنگے ’سنی پیکس‘ سینماؤں میں
عینکیں اور پاپ کارن کے پیکٹس مفت مہیا کیے جاتے ہیں

جب ہم خواب دیکھتے ہیں
تو ہر طرف موت کی باتیں ہونے لگتی ہیں
اور قبروں کی نیلامی شروع ہو جاتی ہے
اور مُردوں کی چہل قدمی کے لیے پارک
اور ڈھانچوں کے دائمی آرام کے لیے
میوزیم تعمیر ہونے لگتے ہیں
رُوحیں دُور دراز کے علاقوں میں ٹرانسفر کر دی جاتی ہیں
اور گورکنوں کو او ایس ڈی بنا دیا جاتا ہے
اور حفظِ ماتقدم کے طور پر
جنت کا کچھ حصہ وی وی آئی پی علاقوں میں منتقل کر لیا جاتا ہے
تا کہ باقی ماندہ ملک کو با آسانی جہنم کا نمونہ بنایا جا سکے!!

(وجاہت مسعود کے لیے)

موت کو پڑھنا آسان نہیں

صبح سورج سے پہلے جاگ اٹھی ہے
اور سلیپر پہنے
شب خوابی کے لباس میں
نیم عُریاں
گھروں سے باہر نکل آئی ہے

سمندر کنارے پر پھیلتا جا رہا ہے
یہاں تک کہ اُس کی گہرائی کم ہوتے ہوتے
صفر اعشاریہ ننانوے ملی میٹر رہ گئی ہے
اور مچھلیاں اپنی مادر زاد برہنگی چھپانے کے لیے
لاشوں کی طرح اوپر تلے گر رہی ہیں
آبی اور زمینی مخلوق میں معانی کا فرق بھی نہیں رہا

وہ دیکھو متن اور حاشیے کے مابین
موت سایوں کی زبان میں لکھی ہوئی ہے
جسے سمجھنے کے لیے
ماقبل اور مابعد زمانوں کی تنہائی درکار ہے

لفظوں اور منظروں کی خودکشی کے بعد
زندگی کو چُپ سی لگ گئی ہے
خوبصورت آنکھوں والے چہروں پر
سیاہ چشمے دیکھ کر
بادلوں کا ہنسنا بلکہ ٹھٹا لگانا قدرتی بات ہے

متن شناسی کے زعم میں مبتلا
پتلے کانوں، موٹی جِلدوں والے نقاد
بوڑھے کچھوؤں کے راگ سُن سُن کر مدہوش ہو رہے ہیں
ایسے میں نظم لکھنا
اور موت کو پڑھنا آسان نہیں!

کُچھ مرنے کے لیے زندہ چھوڑ دیے گئے ہیں

زیادہ تر مار دیے گئے
تشدّد کے بعد
کچھ بھون دیے گئے
آتشیں ہتھیاروں کے ساتھ
اور پھینک دیے گئے اجتماعی قبروں میں
کچھ کی آنکھوں پر
سیاہ پٹیاں بندھی ہوئی تھیں
وہ مرتے ہوئے خود کو بھی نہ دیکھ سکے
کچھ سرحدیں پار کرتے ہوئے
محافظوں کی گولیوں کا نشانہ بن گئے
کچھ کھلے سمندروں میں
ڈوب گئے
اُن میں بچے بھی تھے

بوڑھے اور جوان مرد بھی
لڑکیاں اور عورتیں بھی
کسی کے ہاتھوں پہ لمس تھا
کسی کے ہونٹوں پہ پھول
کسی کی آنکھوں میں خواب
کسی کے سینے میں امید
موت کسی کے دل میں نہیں تھی
لیکن مارے گئے
جو بچ گئے
وہ کیمپوں میں
مرنے کے لیے زندہ چھوڑ دیے گئے ہیں
پتا نہیں انہیں کب، کہاں اور کیسے موت آئے گی!

لاشیں اور دن ترتیب سے گنے جاتے ہیں

جب سب مرد و زن مار دیے گئے
اعضاء بکھرے ہوئے تھے
بے ترتیبی سے
ہاتھ بازوؤں سے الگ
اور پاؤں ٹانگوں سے
سرتن سے جدا
دل سینے سے
اور آنتیں پیٹ سے باہر
شرم گاہیں کھلی ہوئی
اور ذکور کٹے ہوئے

جب سب مار دیے گئے
جسموں کے ٹکڑے اکٹھے کیے گئے

گنتی کے لیے
لاشیں ترتیب سے رکھی گئیں
شناختی نشانوں کے ساتھ
روزنامچے میں
دن، تاریخ اور وقت درج کیا گیا
تا کہ بے حساب مرنے والوں کا
حساب رکھا جا سکے!

جنگ جُو کرد عورتوں کا گیت

ہم قطار در قطار
پہاڑوں اور جنگلوں سے گزرتی ہیں
اور ہوا کی طرح
مشکل راستوں پر چلتی ہیں
ہمارے قدموں کی دھمک سے
موت رقص کرنے لگتی ہے
اور ہماری بندوقوں کا رخ
دشمن کی طرف ہو جاتا ہے

ہم رات کی طرح
دشمن علاقوں میں پھیل جاتی ہیں
اور ہماری صبح مورچوں میں طلوع ہوتی ہے
ہماری آنکھیں تتلیوں کی مانند

لمبی گھاس اور خاردار جھاڑیوں میں بلا وقت گھومتی
اور آسمان پر پرندوں سے تیز اُڑتی ہیں
درخت ہمیں جھک کر ملتے ہیں
اور پتوں کی سرسراہٹوں میں ہمارے دل دھڑکتے ہیں
ہم روحِ جدل ہیں،
نیند میں بھی چوکس رہتی ہیں

ہم بادلوں کے انباروں میں کیموفلاژ
خاموش وادیوں کی بھیدوں بھری گونج ہیں
اپنے آپ میں ہوتی بارشوں کی سرگوشیاں ہیں
راز و نیاز کی باتیں ہیں
ہمیں سن کر
ہمارے بہادر اور محبوب مَردوں کے دل
محبت سے لبریز ہو جاتے ہیں
اور محاذِ جنگ کی طرف بڑھتے ہوئے
اُن کے قدم تیز ہو جاتے ہیں

مائیں ہمیں الوداع کرتے ہوئے
روتی نہیں،
دُعاؤں اور بوسوں کے پھول نذر کرتی ہیں

جنگاہ میں
روٹیاں پکاتے ہوئے
ہمارے ہاتھ گولیوں کی طرح چلتے ہیں

ہم صدائے کوہ ہیں
دشمن ہماری آواز سے ڈرتا ہے
ہمارے نرغے میں آنے سے گھبراتا ہے
مٹی ہماری زیبائش
اور جھیلوں اور ندیوں کا پانی ہمارا آئینہ ہے
لڑائی پر جانے سے پہلے
ہم ایک دوسری کے بال بناتی،
گلے لگتی ہیں
موت ہمارے حُسن پر رشک کرتی ہے
اور ہم شہید ہو کر زیادہ خوبصورت ہو جاتی ہیں!

ہے کوئی لینے والا؟

میرے پاس بہت سی دُھوپ ہے
اور بہت سی چھاؤں
بہت سے درخت
اور پھول
اور تازہ ہوا
ڈھیروں بادل
اور بہت سی بارش
بے شمار موسم
بہت سے دریا
اور سمندر
اور جزیرے
طویل ترین راستے
بے نہایت اسفار

لامحدود رقبے

اور بہت سے شہر

کھڑکیاں اور دروازے

ساباط

اور کشادہ گلیاں

غیر مشروط محبت

اننت خاموشی

اور نامختتم تنہائی

اور بہت سی اَن کہی نظمیں!!!

خام خیالی

جب میں نہیں ہوں گا

تو ہوا

چاروں طرف تنہا پھرے گی

بادل خالی خالی نظروں سے

زمین کی جانب دیکھیں گے

مینہ برسنا،

پھول کھلنا

اور تتلیاں اُڑنا بھول جائیں گی

پودے گملوں میں

پانی نہ ملنے پر

سوکھ جائیں گے

میز پر رکھا ہوا کھانا

میرے انتظار میں ٹھنڈا ہوتا رہے گا

نیم وا کھڑکیوں کے پردے
دھوپ، آندھی اور بارش میں
پھڑ پھڑاتے
اور کمروں کے دروازے
بے مقصد کھلے اور بجتے رہیں گے
گھر میں فالتو بتیاں
جلتی رہیں گی
اور ہر ماہ
بجلی، گیس اور ٹیلیفون کے بلوں کی
آخری تاریخ گزر جایا کرے گی!

بے خبری میں ہم کتنا بدل گئے ہیں

روشنی کرتے کرتے
میری ہڈیوں کا فاسفورس بجھ چکا ہے
اور اُدھر خبریں بناتے بناتے
تمہیں بھی خبر نہیں رہی
کہ تمہارے ہاتھ اب لکھنے کے بجائے
سیاہی کے ٹھپے لگا رہے ہیں
اور خون کے چھینٹے اُڑا رہے ہیں
اور گوشت کے لوتھڑے چن رہے ہیں
انوار فطرت! کب تک قتل ہوتے رہو گے؟
کب تک خودکشی کرتے رہو گے؟

اخبار کا پیٹ کبھی بھرا ہے
یہ تو ساری دنیا کی خبریں کھا کر بھی بھوکا رہتا ہے

وہ دن اچھے تھے
جب تم بے کار تھے
اور میں سارا سارا دن
نقشوں کے پلندے اٹھائے
کھدائیوں کے ڈھیروں اور کنکریٹ کی چھتوں پر کام کرتے ہوئے
آندھی اور بارش کی طرح امنڈنے والی
شاعری کو التوا میں ڈالتا رہتا تھا
تب کوئی این جی او تھی نہ سول سوسائٹی
فوڈ اسٹریٹ نہ گلوریا جینز
سینتورس نہ مونال
کھوکھوں سے چائے پی کر
اور خرکاروں کے کیمپوں میں
گدھوں اور انسانوں کو زنجیروں میں جکڑے ہُوئے دیکھ کر
ہم اداس ہو جاتے تھے
نظموں سے دنیا بدلنے
اور جبری مشقت کے خاتمے کے خواب دیکھا کرتے تھے
خرکاروں کی جگہ اب بھاری بھرکم مشینری نے لے لی ہے

ہش ہش کی آوازیں مشینوں کی گھر گھراہٹ میں بدل چکی ہیں
لیکن جبری مشقت اب بھی جاری ہے
نت نئے ناموں اور داموں کے ساتھ ——

ہم دو چار تھے
لیکن شہر کے سارے منظروں، پارکوں، سنیما گھروں، چائے خانوں
اور ادیبوں پر بھاری ہوتے تھے
اسلام آباد کی سڑکیں
ہمارے قدموں تلے بچھ بچھ جاتی تھیں
دامنِ کوہ کے درخت اور جھاڑیاں
روز گارڈن کے پھول اور روشیں
شکر پڑیاں کی مِنی پہاڑیاں
میلوڈی اور آب پارہ کی شامیں
ہماری دوستی کا دم بھرتی تھیں
سپر مارکیٹ کے ریستوران
ماہِ صیام میں بھی جیسے ہمارے ہی لیے کھلے رہتے تھے
سیاحوں اور ہپیوں کے سفری خیمے
عجیب کشش رکھتے تھے
اور ہمیں اپنی طرف بلاتے تھے
سید پور کے چشمے اور آبشاریں

ہمارے جسموں کی مَیل دھویا کرتی تھیں
اور ہماری روحوں کی اجلاہٹ دیکھ کر شرماتی تھیں
پتھروں پر بیٹھ کر باتیں کرتے ہوئے
ہوا بِن بلائے ہماری گفتگو میں شریک ہو جاتی تھی
یہاں تک کہ بادل
مرگلا کی پہاڑیوں سے نیچے اتر کر
ہماری نظمیں سننے آ جاتے تھے
صدر کی بک شاپس اور پرانی کتابوں کے تھڑے
ہمارے اتواروں کی سب سے بڑی عیاشی ہوتے تھے
اور ہم ایک دوسرے سے ملے بغیر
ایک دن بھی بمشکل گزارتے تھے
اب ہم ایک ایک اکیلے ہو چکے ہیں
اور مہینوں، برسوں ایک دوسرے کو دیکھے بغیر زندہ رہ سکتے ہیں
انوار فطرت! اک دن بس اک دن
خبر کی دنیا سے باہر نکل کر دیکھو
بے خبری میں ہم کتنے بدل چکے ہیں

انوار فطرت! آبِ قدیم کے ساحلوں پر
کب تک کھڑے رہو گے؟
دُنیا نئے آبی ذخیروں کے لیے برسرِ پرخاش ہے

گرم پانیوں اور برفانی چوٹیوں کے درمیان
نئی شاہراہیں تعمیر ہو رہی ہیں
سمندر جو تمہیں دیکھنے کے لیے ہلکان ہوتا تھا
اور آبی پرندوں کے شور اور ماہی گیروں کے گیتوں سے بھرا رہتا تھا
گہرے پانیوں کی بندرگاہ میں تبدیل ہو چکا ہے
اب وہاں جل پریاں اور بادبانی کشتیاں نہیں
کوئلے اور یوریا کھاد سے لدے جہاز آتے ہیں!!

(انوار فطرتؔ کے لیے)

آخری لفظ کے بے کار ہونے تک لکھتے رہو!

کبھی کبھی یوں لگتا ہے
جیسے دُکھ کے مقابلے میں
خوشی ناقابلِ حصول ہے
یہ سچ ہے کہ چاند اور ستارے اب روشنی کی امید نہیں،
شب کی علامتیں ہیں
جو کثرتِ استعمال سے کلیشے ہو چکی ہیں
وقت کے تاریک سمندر میں
سورج کے ابھرنے اور ڈوبنے سے بھی اب کوئی فرق نہیں پڑتا
لیکن آخری حرف کے طلوع ہونے کا انتظار تو کیا جا سکتا ہے

زمین کائنات کا قبائلی علاقہ ہے،
ازلی گنہ گاروں کی آماجگاہ
جہاں جنت سے نکالے گئے مرد و زن رہتے ہیں

یہ ابھی آسمان کے مقابلے میں بہت پس ماندہ ہے
یہاں ہم اپنی مرضی سے
جینے یا مرنے کے حق میں ووٹ نہیں دے سکتے

کتنی عجیب بات ہے
کہ زیادہ تر نظمیں اور کہانیاں
دلوں اور سرحدوں کے آس پاس
کسی قومیت کے بغیر جنم لیتی ہیں
اور سرحدیں پار کرتے ہوئے
غیر قانونی داخلے یا جاسوسی کے الزام میں دھر لی جاتی ہیں
ایک ملک سے دوسرے ملک میں جانے کے لیے
بارش اور ہوا کو بھی ویزے سے استثنا حاصل نہیں
جنگل کے پھول بھی
پرمٹ کے بغیر اپنی خوشبو برآمد نہیں کر سکتے
پہاڑوں کی چوٹیاں
آمنے سامنے ہونے کے باوجود
ایک دوسری سے گلے نہیں مل سکتیں
سرحدوں کے طرفین
اجازت ناموں کے لیے
بادل لمبی لمبی قطاروں میں کھڑے رہتے ہیں

یہاں تک کہ پسینے میں شرابور ہو جاتے ہیں

کسی دُور اُفتادہ ستارے پر رہنے والوں کے لیے
یہ دنیا پیدا بھی نہیں ہوئی ہو گی
لیکن ہم اسے تباہ ہوتے ہوئے بے بسی سے دیکھ رہے ہیں
اور لکھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے
سچ ہے کہ شاعری دنیا کا نظام نہیں بدل سکتی
وہ تو داس کیپیٹل بھی نہیں بدل سکی
کیونکہ مارکس بھی
شاعری کے راستے سے اشتراکیت میں داخل ہوا تھا
تو پھر یہ کیا ہے جو باہم دگر ملا ہوا ہے؟
یہ کیسی جنگ ہے؟
بم کہیں اور گرتے ہیں
اور دھمک ہمارے دلوں تک آتی ہے
دیواریں کہیں اور ہلتی ہیں
اور شیشے ہماری کھڑکیوں کے ٹوٹتے ہیں
کہیں دُور کسی قلم سے خون رستا ہے
اور یہاں ہماری نظمیں رونے لگتی ہیں

تاریخ کے راستوں پر پسپا ہوتے ہوئے

کتابوں کی جلی ہوئی لاشوں کے پاس
جھلسے ہوئے متن کے گھمسان میں
زندگی کو افسردہ دیکھ کر
ہم اس کو دلاسا دینے بھی نہیں رک سکتے
پتا نہیں وہ کس لفظ کی محبوبہ تھی
جو راکھ اور دھویں کی لامختتم ضخامت میں
جانے کون سا معنی، کون سا تناظر ڈھونڈ رہی تھی
آہوں، کراہوں اور سسکیوں کے انبار میں
نظموں کے پیکر اور کہانیوں کے کردار کہیں نیچے دب جاتے ہیں

مسودوں اور عبارتوں کے جنک یارڈ میں
پھٹے پرانے کاغذوں
اور سیل میں خریدے ہوئے کپڑوں اور جوتوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا
خلیہ در خلیہ ڈھیر ہوتی ہوئی شاعری
وقت کا نامیاتی سلسلہ ہے
اے دُنیا بھر کے شاعرو!
آخری لفظ کے بے کار ہونے تک لکھتے رہو
یہاں تک کہ سیاہی کا سارا محلول ختم ہو جائے
شاید روشنی ہمارے ضیا ترس پہاڑ جیسے جسموں
اور جنگل جیسی گنجان روحوں کے آر پار جانے لگے!!

زندہ قبریں

ہم اندر ہی اندر
نامعلوم اترائیوں میں پھسلتے جا رہے ہیں
مسلسل فرد ریزی سے
ہمارے جسموں کے پہاڑ آدھے رہ گئے ہیں
اور رُوحیں چوتھائی سے بھی کم

منافقت کے جراثیم
ہمارے تولیدی نظام میں سرایت کر چکے ہیں
ہم نسل در نسل سماجی بالشتیے پیدا کرتے ہیں
اور طویل قامتی کے لیے
درآمدی بیساکھیوں کا بیوپار

اور خوشامدی چوزوں کی
جلد بڑھوتری کے لیے مقوی راتب بناتے ہیں

ہم اپنے مُردوں کے انتظار میں کھدی ہوئی
زندہ قبریں ہیں
اور اپنے پُر ہجوم جنازوں کو
دیکھ دیکھ کر خوش ہونے والے
مُردہ وجود!!

مَرے ہُوؤں کی موت

جو پہلے سے مر چکے ہوں
اُن کے مرنے کا اعلان عجیب لگتا ہے
لوگ لاشوں کے مر جانے پر سوگ مناتے ہیں
اور زندوں کو مار کر
بھنگڑے ڈالتے ہیں
فرشتوں کو ڈرانے کے لیے
ہوائی فائرنگ کرتے ہیں
اور خدا کو خوش رکھنے کے لیے
قربانی کرتے
اور لنگر بانٹتے ہیں

یوں تو ہر روز
کوئی نہ کوئی زندہ اٹھا لیا جاتا ہے

یا کسی نہ کسی مُردے کی موت ہوتی ہے
لیکن جب کسی سیاست دان کی لاش مرتی ہے
تو جنازہ پڑھنے والوں کا ہجوم ہوتا ہے
ڈھانچے جوق در جوق تعزیت کے لیے آتے ہیں
اور کافور میں لتھڑی
اُس کی بدبودار رُوح کو
دل ہی دل میں گالیاں دیتے ہوئے
خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں
مرنے والا اللہ کا نیک بندہ تھا!

Scanned by CamScanner

محبت اصلی مشین گن نہیں چلاسکتی

محبت بادلوں کی طرح آسمان سے برستی ہے
اور پانی کی طرح زمین پر بہتی ہے
اور ہوا کی طرح
درختوں کے پتوں کو چھیڑتی،
چہروں کو چھوتی ہوئی
کبھی نہ ختم ہونے والے راستوں نا راستوں پر
بے پا افشار چلتی رہتی ہے
محبت نفرت کا اینٹی سیرم ہے
کبھی نہ ایکسپائر ہونے والی ویکسین ہے
جو جسموں کی دبیز ترین تہوں سے گزر جاتی ہے
زمین محبت کی آخری پناہ گاہ ہے
یہاں اسے کوئی نہیں مار سکتا
تمام تر نفرتوں کے باوجود

یہاں وہ جنگلوں، پہاڑوں ندیوں، کھیتوں
اور کھیتوں میں کام کرنے والے
مردوں اور عورتوں کا روپ دھار لیتی ہے
پھولوں کے رنگوں
اور تتلیوں کے پروں میں کیموفلاژ ہو جاتی ہے
اور کبھی کبھی تو شرارتی بچوں کی طرح
شہد کی مکھیوں
اور بھڑوں کے چھتوں میں جا گھستی ہے
اور کبھی زیادہ غصے میں ہو
تو معصوم کیڑوں مکوڑوں کو پاؤں تلے مسل ڈالتی ہے
یا چیونٹیوں کے سوراخوں میں پانی بھر دیتی ہے
یا کھلونا مشین گن سے
نقلی فائرنگ کرتے ہوئے تڑ تڑ ہنستی ہے
محبت اِس سے زیادہ کسی ذی حس کو نقصان نہیں پہنچا سکتی
انسانوں سے تو وہ تا دیر ناراض بھی نہیں رہ سکتی
سوائے دہشت گردوں کے
جن کے قریب جانے سے وہ ڈرتی ہے
کیونکہ محبت اصلی مشین گن نہیں چلاسکتی!

تاریخ کے راستوں پر

تاریخ جن راستوں سے گزرتی ہے
ان پر انسانوں کے ساتھ ساتھ
گھاس اور پھولوں کی پتیاں بھی پامال ہو جاتی ہیں
تاریخ کے راستوں پر
ہواؤں کے نقوشِ پا کون تلاش کرے گا ؟
عجائب گھروں میں
مرنے والوں کے حنوط شدہ سر
اور فاتحین کے کاسٹیوم رکھے جاتے ہیں
ہارنے والوں کی
رُوحیں اور خواب نہیں

تاریخ کے معرکوں میں
خوابوں کی جیت ہوتی ہے نہ ہار

یہ ٹوٹتے بکھرتے اور پھیلتے رہتے ہیں
اور قدیم پناہ گاہیں چھوڑ کر
نوزائدہ دلوں اور ذہنوں میں جاگزین ہو جاتے ہیں

تاریخ کی غارت گری میں
لفظ اپنے معانی بدل کر
علامتوں، استعاروں، غیر مرئی پیکروں
اور نظر نہ آنے والے منظروں میں
کیموفلاژ ہو جاتے ہیں
اور کبھی کبھی تو
کاغذوں اور حاشیوں سے باہر نکل کر
کائنات کی کسی دُور دراز نکڑ میں
محوِ مطالعہ
خود فراموش خدا کی تنہائی میں گونجنے لگتے ہیں
یہاں تک کہ وہ تنگ آ کر
عظیم خاموشی کی کتاب بند کرتے ہوئے
تاریخ کا پہیہ گُھما دیتا ہے!

اور دکھائی نہ دینے والے
پرندوں کی سبز چہکار ہے
ماں کے ہاتھوں کا لگایا ہوا پودا ہے
جو ایک دن پھولوں سے بھر جاتا ہے
خاموش لوریوں کی گونجیلی اُونگھ میں
آسمان کے رُخ پر کھلنے والی کھڑکی ہے
دائمی خواب گاہ کا دروازہ ہے
نیند میں چلنے کا
آخری دورانیہ ہے!

مَشی فی النَّوم

زندگی دیواروں پر لکھا ہوا اشتہار ہے
جسے بارشیں پڑھے بغیر
مٹا دیتی ہیں
اندھیرے کی ابد میں
غروب ہوتا ہوا دن ہے
رکا ہوا راستہ ہے
جسے آخرش
لامعلوم انتہاؤں کی جانب چلنا ہے
زمانوں کی بوسیدہ تنہائی میں
گُم کردہ محبت کی سرگوشی ہے
قدیم عمارتوں کے
باغاتی اشجار میں
ہوا کا سرسراتا ہُوا سُرخ گیت

شہر گڑیا کی آنکھ سے بڑا ہو گیا ہے

مظہر الاسلام!
جب ہم ایک دوسرے کا سایہ تھے
تب دیواریں تھیں نہ دھوپ
درخت ہمیں چھاؤں دیتے تھے
اور سڑکیں ہمیں گھیر گھار کر
میریٹ سے ہاتھی چوک تک لے جاتی تھیں
ہائی ٹی، فرائی مچھلی، پیزے اور یونائیٹڈ کے کیک
ہماری دوستی کی علامت تھے
میں پیدل تھا
اور تم گاڑی پر
لیکن ہم ایک ساتھ چلتے تھے

راستے ہمیں دیکھ کر ہنستے
اور فاصلے ہم پر رشک کرتے تھے

مظہر الاسلام! شام ہونے کو ہے
اور تمہارے ہاتھ سے لکھی ہوئی
"خط میں پوسٹ کی ہوئی دوپہر"
ابھی تک شیلف میں پھیلی ہوئی ہے
"باتوں کی بارش میں بھیگتی لڑکی"
جانے کن سمندروں کے پار چلی گئی ہے
یادوں کے بادل روز امنڈ کر آتے ہیں
اور برسے بغیر چلے جاتے ہیں
"گھوڑوں کے شہر میں اکیلا آدمی"
آج بھی اکیلا ہے
لیکن گھوڑوں اور اصطبلوں کی تعداد بڑھ گئی ہے

مظہر الاسلام!
اب کس "گڑیا کی آنکھ سے شہر کو دیکھو" گے
بم دھماکوں سے گڑیا کا سر کوڑے دان میں جا گرا ہے
اور سرخ فراک کو آگ لگ گئی ہے
اور شہر جو ہمارے اندر ہنستا بستا تھا

ہمارے جسموں اور اپنی حدوں سے تجاوز کر چکا ہے
اور خواہشوں کے جلوس لانگ مارچ اور دھرنوں میں بدل گئے ہیں
"محبت مردہ پھولوں کی سمفنی"
زندہ کب تھی؟
وہ تو ہم ہیں
جو اسے نظموں اور کہانیوں میں زندہ رکھتے ہیں
اور خود عمر بھر مرتے رہتے ہیں
"دُعا، دُکھ اور محبت کے موسموں کا پھول"
اب ہونٹوں کی شاخوں پر نہیں
لیپ ٹاپ کی اسکرین پر کِھلتا ہے
اور موت اپنے فن کا مظاہرہ
آن لائن کرتی ہے

مظہر الاسلام!
خدا انسانوں سے اتنا بھی مایوس نہیں ہُوا
جتنا ہم نے سمجھ لیا ہے
تیز رو وقت نے راستہ ضرور بدلا ہے،
سفر کا اختتام نہیں
انت وہی ہے جو ہر روز ہوتا ہے
اور ابد تا مابعد ابد ہوتا رہے گا

بس اتنا فرق پڑا ہے
کہ ہم آغاز سے بچھڑ گئے ہیں
اور انجام کار ایک ایسی دنیا میں آ گئے ہیں
جو شاید ہمارے لیے تھی ہی نہیں
عمروں اور لفظوں کے اسی ادھیڑ بُن میں
ہم کاغذ کے جہاز اُڑاتے اُڑاتے اسپیس شپ اُڑانے لگے ہیں
اور زندگی اتنی مصروف اور غرض آشنا ہو گئی ہے
کہ یادیں بھی کسی مطلب کے بغیر نہیں آتیں
اور ہماری ملاقاتوں میں
ڈھابوں کی جگہ گلوریا جینز نے لے لی ہے!!

(مظہر الاسلام کے لیے)

میں تمہارے لیے نظم نہیں دُعا لکھنا چاہتا ہوں

علی محمد فرشی!

تیز ہوا میں جنگل نے تمہیں بلایا

اور تم نہیں گئے

زندگی نے تم پر خودکشی کا مقدمہ قائم کیا

تم نے پیروی نہ کی اور صاف بچ گئے

حالانکہ تم مجرم تھے

اور عدم پیشی کے باعث توہینِ مرگ کے مرتکب ہوئے

علینہ لکھتے لکھتے

تم مذکر سے مونث ہو گئے

اور تمہاری دودھیا ممٹیوں پر

دکھ کا لال پرندہ آ کر بیٹھ گیا

کبھی نہ اُڑنے کے لیے

اور آخر کو تم ایسے دوستوں اور نقادوں کے ہتھے چڑھ گئے

جنہوں نے تمہیں

شاعر کے منصب سے اُتار کر

عظمت کی سُولی پر چڑھا دیا

علی محمد فرشی!

چم چم چمکتے بوٹوں اور لش لش کرتے اجلے کپڑوں سے

دنیا کی ڈسٹ اور اندر کی مَیل کم نہیں ہوتی

بلکہ اور نمایاں ہو جاتی ہے

بھاگتے ہوئے ہر چیز پیچھے کی طرف جاتی ہے

یہاں تک کہ آدمی تنہا رہ جاتا ہے

لیکن یہ شریفانہ فلسفے تم کہاں مانتے ہو

تم ازلی جھگڑالو ہو

ذرا ذرا سی بات پر

اپنی ہی لاش کی شہ رگ کاٹ لیتے ہو

گلوب اٹھا کر پھینک دیتے ہو

یہاں تک کہ آفرینش میں نقص نکالنے لگتے ہو

اور اپنے زعم میں

بِگ بینگ اور بِگ کرنچ تک جانے سے بھی باز نہیں آتے

اور وقت کا پہیہ گھما کر

سارے کا سارا اپنی طرف کھینچ لیتے ہو

جب دُنیا ارتقا پذیر تھی
اور انسان ابھی بوزنہ نما تھا
تم اُس وقت بھی خدا سے بحث کر رہے تھے
اور کبھی نہ لکھی جانے والی نظموں کی تشریح کرتے کرتے
صدیوں کے ڈیپریشن میں چلے گئے تھے
شکر ہے اُس وقت میں وہاں نہیں تھا
ورنہ تم مجھے کبھی معاف نہ کرتے
معاف تو تم نے اب بھی نہیں کیا
خیر چھوڑو ــــــــ
آبِ دانش پی پی کر
اب تم تھوڑے مہذب ہو گئے ہو
اور غصے اور نشے میں بھی
گالیوں کی بجائے نظمیں دیتے ہو

علی محمد فرشی! میں تمہارے لیے نظم نہیں دُعا لکھنا چاہتا ہوں
تا کہ تم آسانی سے مجھے بُھلا سکو
اور مشکل سے یاد کر پاؤ
وقت اتنی ذلیل چیز ہے

کہ پتا بھی نہیں چلتا اور پیروں تلے سے
کارپٹ کیا فٹ پرنٹس بھی کھینچ لیتا ہے
زندگی اُڑن طشتری نہیں کہ کسی کسی کو دکھائی دے
یہ ہر ذی روح پر اترتی ہے
اور موت سے ہم کنار کرتی ہے
زمین پر کسی اور سیارے کی مخلوق بن کر رہنے سے
انسان افضل نہیں ہو جاتا
مٹھی کھولو اور دیکھو کتنی ریت گرتی ہے
ہاتھ اٹھاؤ اور دیکھو کتنے آسمان بادلوں سے بھر جاتے ہیں

علی محمد فرشی! جب رات دروازے وا کرتی ہے
تو اندھیرا جوق در جوق اُس کی طرف جاتا ہے
جیسے بچے ماؤں کی طرف بھاگتے ہیں
لیکن جب مائیں ہی نہیں رہیں
تو پھر دوڑنا کیسا
میں تو یہیں رک جانا چاہتا ہوں
اِسی لمحے،
اُس گھڑی کی طرح جس کے سیل اچانک ختم ہو جائیں
لیکن تم ــــــــ
تم چلتے رہو جہاں تک چل سکتے ہو

مجھے یقین ہے
کہ جب صبح طلوع ہو گی
تو روشنیوں کے پرندے
اپنے اپنے ڈربوں اور درختوں کی شاخوں سے نکل کر
نظموں کی چھتریوں پر بیٹھ جائیں گے
اور زمین لفظوں سے بھر جائے گی !

(علی محمد فرشی کے لیے)

آئن اسٹائن شاعر نہیں تھا

آئن اسٹائن کو معلوم تھا
کہ کائنات پھیلتی جا رہی ہے
اور آخرش اپنے آپ میں سمٹ جائے گی
آخری چرمراہٹ کے بعد ——

لیکن آئن اسٹائن شاعر نہیں تھا
اسے معلوم نہیں تھا
کہ دیواروں کے آر پار دیکھ لینے سے
زندگی اتنی عریاں ہو گئی ہے
کہ ہماری ہڈیوں کا پگھلا ہوا گودا بھی نظر آنے لگا ہے

اور زمان و مکاں کی ساری اداسی
ہمارے دلوں میں سے گزرتی ہوئی صاف دکھائی دے رہی ہے
اور ہمارے خواب فرشتوں پر عیاں ہو گئے ہیں

اور وہ حیران ہیں
کہ خوابوں کی دنیا میں انسان اتنا بے بس کیوں ہے
اور روشنی کی رفتار حاصل کر لینے کے باوجود
بھاگ کیوں نہیں سکتا!

وقت کی بوطیقا

وقت کا اپنا کوئی وزن نہیں ہوتا
لیکن یہ جس کا ہو جائے اُسے بھاری کر دیتا ہے
اور جس کا نہ ہو اُسے بے وزن

وقت کی اپنی کوئی شکل بھی نہیں ہوتی
ہم ہی اس کا چہرہ ہیں
ہم ہی آنکھیں
اور ہم ہی اس کے پاؤں
لیکن کبھی کبھی یہ ہم سے آگے نکل جاتا ہے
یا ہم اس سے پیچھے رہ جاتے ہیں
متواتر اس کے ساتھ چلنا

دُنیا کا مشکل ترین کام ہے

بعض لوگ وقت کو پہیے لگا لیتے ہیں یا پَر
اور دوڑنا یا اُڑنا شروع کر دیتے ہیں
یہاں تک کہ وقت کی یا ان کی اپنی حد ختم ہو جاتی ہے
وقت سدا دوڑ سکتا ہے نہ اُڑ سکتا ہے
اسے بس چلتے رہنے کے مَوڈ میں رکھا گیا ہے
اس کی اصل سائنس کیا ہے
اسے کب چلنا ہے
اور کب رُک کر عظیم دائمی ٹھہراؤ کا حصہ بن جانا ہے
یہ کوئی نہیں جانتا!

خدا نظموں کی کتاب ہے

نظمیں لکھتے ہوئے
میں نے اَن گنت کاغذی دیپ جلائے
جگنوؤں کو لفظوں کی مٹھیوں میں ادھ موا کر دیا
کئی چاند درختوں پر اُلٹے لٹکا دیے
اور رات بھی اتنی لکھی
کہ پہلی سے آخری سطر تک ہر نظم سیاہی میں لتھڑ گئی
لیکن میں کسی نظم میں ستارہ نہیں لکھ سکا
ستارے خدا کی ملکیت ہیں
اور خدا اپنی جائیداد کسی کو منتقل نہیں کرتا
زمین تو اسے مجبوراً انسان کے حوالے کرنا پڑی
ورنہ انسان جنت کو بھی خُودکش دھماکے سے اُڑا دیتا

خدا نظم لکھ سکتا ہے نہ پڑھ سکتا ہے
لیکن خود اتنی بڑی نظم ہے
کہ انکاری دلوں کو بھی ازبر ہے
خدا نظموں کی کتاب ہے
اور گیتوں کا منبع
خدا نے مجھے کئی بار کہا
چھوڑو شاعری
اور کائنات کی دائمی خاموشی بن جاؤ
یا زمین کے ایک حصے پر پھیلی ہوئی رات
کم از کم نظم کو
اپنے اندر سے طلوع ہوتے ہوئے تو دیکھ سکو گے
خدا سب کچھ جانتا ہے
اُسے معلوم تو ہو گا
کہ روشنی کے بھوکے لوگ
نظموں سے ستاروں بھری رات بھی چوری کر لیتے ہیں!

ایک وقت آتا ہے

ایک وقت آتا ہے
جب سب دروازے بند ہو جاتے ہیں
پاؤں چلنا چاہتے ہیں
لیکن راستہ نہیں ہوتا

یُوٹیوب پر
کسی دُور دراز ملک کی
حزنیہ موسیقی سنتے ہوئے
یا کوئی درد انگیز فلم دیکھتے ہوئے
آنکھیں بھیگنے لگتی ہیں

نئے مکان میں
پرانی کتابیں سمیٹتے ہوئے،

آبائی گھر کو یاد کرتے
یا کسی کو الوداع کہتے ہوئے
دِل رُکنے لگتا ہے

دُھوپ بھرے چبوتروں میں
خالی کرسیوں پر
اُداسی آ کر بیٹھ جاتی ہے
اور ذرا ذرا سی بات پر
دُھند اور بارش کا موسم چھا جاتا ہے

ایک وقت آتا ہے
جب آدمی
سب کے ہوتے ہوئے بھی تنہا رہ جاتا ہے!

یُونیا

مجھے مت پہنو!
میں تمہاری مٹی جیسا شفّاف
اور تمہارے ریشم جیسا نرم نہیں
تمہاری محبت کا سینہ سڈول ہے
اور ٹانگیں لمبی
اور بازو پھیلے ہوئے
مَیں، چھانٹی کا مال،
تمہارے بدن پر پورا نہیں آؤں گا
کہیں نہ کہیں سے چھوٹا پڑ جاؤں گا!!

خودفریبی کے سرد خانے میں

دنیا خودفریبی کے سرد خانے میں رکھا ہوا
گلا سڑا آلو ہے
جسے کائنات سے باہر پھینکنے کے سوا کوئی چارہ نہیں
تا کہ باقی ماندہ خدائی کو
پھپھوندی لگنے سے بچایا جا سکے

نظمیں لکھتے اور پڑھتے ہوئے
مجھے رونا نہیں آتا
ہنسا بھی نہیں آتا
جیسے کیفیت لاتعین ہو جائے
مجھے نہیں پتا میں کیا کہنا چاہتا ہوں
لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں

کہ جب دروازے کھلے ہوں
اور ہوا گزرتی ہو
اور چاند چمکتا ہو
اور سورج نکلتا ہو
اور بچے اسکول جاتے ہوئے
اپنی عمروں سے بڑے ہو رہے ہوں
اور معنی کا متن سے باہر
اور نقادوں کی فہم سے بالا ہونے کے باوجود
تخلیق کا عمل جاری ہو
تو کچھ نہ کچھ اچھا ضرور ہوتا ہے

یہ راز نہیں حقیقت ہے
کہ تنکا اپنے باطن میں
آگ کے علاوہ نمی بھی رکھتا ہے
جو اُسے جلنے سے بچائے رکھتی ہے
ورنہ ہر شاعر اپنی ہی آگ میں جل جاتا ہے
خودشعلگی میں کوئی تھوڑا بہت بچ بھی جائے
تو اُسے زمانے کی موت مار دیا جاتا ہے

شاعری اور موت کا سمبندھ بڑا پرانا ہے

اِسی لیے میں اکثر کہتا ہوں
کہ کچن گارڈن میں سبزیاں اُگا کر
زندہ رہنا
اور اپنے علاوہ سونڈیوں کا پیٹ بھرنا
بھوک ماری، گھن لگی دانش سے کہیں بہتر ہے

چیونٹیوں کے سامنے عظیم ہونے کے لیے
شاعری کی نہیں
ایک معمولی انسان بننے کی ضرورت ہے
جو زمین کے سینے پر گھاس کی طرح پھیل سکے
اور ہوا کی طرح چل سکے
میں نے اِس بار جو مرچوں کے پودے لگائے ہیں
دیکھنا! جلد ہی وہ ہری کچور نظموں سے بھر جائیں گے!!

(پروین طاہر کے لیے)

گوتم نے خودکشی کر لی ہے

روش ندیم! تمہارے لیے آسانی سے ایک نظم لکھی جا سکتی ہے
اور تمہیں دیکھنے کے لیے محدب عدسے کی ضرورت نہیں
تم سے پہلے تمہاری عینک کے شیشے نظر آ جاتے ہیں
اور تمہاری آنکھیں
ہونٹوں سے زیادہ مسکراتی ہیں
تمہاری مابعد جدیدی محبت قابلِ رشک ہے
تم کسی کو گھر نہیں بلاتے
اور منیلاؔ کے بغیر کہیں نہیں جاتے
اور تربوز کا شیک پیتے ہوئے یوں شرماتے اور گھبراتے ہو
جیسے کوئی "ترقی شدہ" پینڈو پہلی بار رام رنگی پی رہا ہو

تمہاری نظمیں پڑھتے ہوئے
ٹشو پیپر بھیگ جانے کے ڈر سے

رویا نہیں جا سکتا

ہنسا بھی نہیں جا سکتا

کہیں دھیان کی گمبھیرتا نہ ٹوٹ جائے

جانے کیسے تم سدھارتھ کے ساتھ اونچی آواز میں باتیں کرتے

بلکہ ٹھٹھے لگاتے ہو

اور دہشت کے موسم میں نظمیں لکھتے ہو

اس موسم میں تو نظمیں نہیں لاشیں لکھی جاتی ہیں

اور نوحے پڑھے جاتے ہیں

منٹو کی عورتیں

تمہارے اتہاس کی سطریں ہیں

اور تمہارے دکھ کی انا میکا

گوتم کے قدموں سے بڑی ہے

آج گوتم کو اعلیٰ ترین ڈگری

اور بہترین تجربے کے باوجود

نوکری کے لیے سفارش کی ضرورت پڑتی

تو اسے معلوم ہوتا کہ دکھ کیا ہے

روش ندیم! تم نے شاید صبح کا اخبار نہیں دیکھا

گوتم کو اب نوکری کی ضرورت نہیں رہی

اُس نے چوک میں ڈگری جلا کر

خود کو بھی آگ لگا لی تھی

بے چارہ ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی

نروان پا چکا تھا ——

خیر چھوڑو

ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے

کہیں اسے تجریدی مکھیاں اور تنقیدی ڈائنوسار نہ کھا جائیں

بھوکے پیٹ تو لیکچر بھی نہیں دیا جا سکتا!

(روش ندیم کے لیے)

خدا زمین پر صبحیں لکھنا بھول گیا ہے

دن چڑھے کے خواب
شام کی آنکھوں میں بہنے لگے ہیں
رات کناروں تک بھر گئی ہے
اور کسی بھی لمحے چھلک کر
کائنات سے باہر جا گرے گی
خدا زمین پر صبحیں لکھنا بھول گیا ہے
اور شاعروں کے پاس
اتنی روشنائی نہیں
کہ لوڈ شیڈنگ کی ماری ہوئی
دھرتی روشن کر سکیں
وہ محض نظمیں لکھ سکتے ہیں
یا زیادہ سے زیادہ
مرگِ خود پر
تعزیتی قرارداد پیش کر سکتے ہیں!

وہ مجھے کیوں مارنا چاہتے ہیں؟

میں ایک پُرامن، قانون پسند، محبِ وطن
اور شریف شہری ہوں
آخری تاریخ سے پہلے
بجلی، گیس، فون اور پانی کے بل جمع کراتا ہوں
ٹیکس دیتا ہوں
ٹریفک کے اشاروں کی پابندی کرتا ہوں
دفتر سے کبھی لیٹ نہیں ہوتا
وقت پر گھر پہنچتا ہوں
معمولی کاموں کے لیے بھی
اپنی باری کے انتظار میں
گھنٹوں قطار میں کھڑا رہتا ہوں
عام آدمی کی طرح خواب دیکھتا

اور سایوں کی طرح زندگی گزارتا ہوں
نہ تاریخ کا حصہ ہوں
نہ کسی لشکر کے لیے سدِ راہ
بے وجہ پکڑے جانے سے ڈرتا ہوں
جلسوں، جلوسوں اور دھرنوں میں
سب سے پیچھے کھڑا ہوتا ہوں
سیر کے دوران
خاموشی سے راستے کے ایک طرف چلتا ہوں
اور سڑک پار کرتے ہوئے
دونوں طرف دیکھتا ہوں

روزمرّہ کی چوہا دوڑ میں
دوسروں کو روند کر آگے نہیں بڑھتا
تیز بھاگنے والوں کے لیے
میدان کھلا چھوڑ دیتا ہوں
سچ بولتے بولتے جھوٹا بن جاتا ہوں
اور دوستوں کو آگے بڑھاتے بڑھاتے
خود پیچھے رہ جاتا ہوں
بہت اُداس ہو جاؤں تو
کتابیں پڑھتا ہوں

نظمیں لکھتا ہوں
موسیقی سنتا ہوں

صبح اٹھ کر اخبار دیکھتا ہوں
اور شب خوابی سے پہلے
ٹی وی پر خبریں سنتا ہوں
زندہ ہوں لیکن لگتا ہے
زندگی کا بوجھ اُٹھاتے اُٹھاتے
جیتے جی مر چکا ہوں
صرف اعلانِ مرگ باقی ہے
پھر بھی وہ دن رات میرا پیچھا کرتے
اور مجھے بے موت مار دینا چاہتے ہیں!!

اجلاس ابھی جاری ہے

پارلیمان میں بحث جاری ہے
کہ عورتوں کو مارنے کا
جائز طریقہ کیا ہے؟

انہیں ہلکے پھلکے تشدد سے مارا جائے
یا تیزاب پھینک کر
چہرے مسخ کیے جائیں
یا تیل چھڑک کر آگ لگائی جائے
زہر دیا جائے
یا چوہے مار گولیوں سے کام چلایا جائے
یا پنکھوں سے لٹک کر
خودکشی پر مجبور کیا جائے
جنابِ اسپیکر!

دوپٹے کا اس سے اچھا استعمال اور کیا ہو سکتا ہے
خاص طور پر نچلے طبقہ کی عورتوں کے لیے
یہ طریقہ مناسب رہے گا
اس پر ٹیکس کی چھوٹ دی جا سکتی ہے
کلہاڑی کے وار بھی کارگر ہو سکتے ہیں
اور ٹوکے سے ہاتھ پاؤں بھی کاٹے جا سکتے ہیں
ناک، کان، زبان اور چٹیا کاٹنا تو روزمرہ کی بات ہے
گھریلو چھریوں سے کام چل سکتا ہے
بیگمات اور خواتینِ فلک کے لیے
خواب آور دوائیں آسان حل ہے

جنابِ والا!
ان کے حاملہ پیٹوں پر
گھونسے اور لاتیں مارنا ہرگز قابلِ مذمت فعل نہیں
ان کے خلاف آپریشن "ضربِ خفیف" جاری رکھا جائے
اور ضرورت پڑنے پر
"ضربِ شدید" اور "ضربِ لازب" میں بدل دیا جائے
تاکہ آنے والی روحیں
نیل کے اَن مٹ دھبوں سے گودی ہوئی ہوں
یوں اُن کی زمانی شناخت میں

اگلی حکومتوں کو وقت نہیں ہو گی
حق بخشوا کر، وٹا سٹا، متعہ، کم سنی کی شادیاں
اور ونی کر کے بھی
انہیں جیتے جی مارا جا سکتا ہے
اور کاری قرار دے کر قتل کرنا تو عین کارِ ثواب ہے
جنابِ عالی! یہ سب چھوٹے چھوٹے حربے ہیں
جن پر یہ خواہ مخواہ واویلا مچاتی رہتی ہیں
حکومت ان کے ٹسووں میں نہ آئے
اور بہادر ضارب کے لیے
خصوصی مراعات اور "نشانِ ضرب" کا اعلان کرے

والا نگاہ عالی مرتبت ممبران!
غور فرمائیں
اس کج مخلوق کے زیرِ ناف حصوں کو
گرم سلاخوں سے داغا جائے
یا سینے کے ابھاروں کو کاٹ کر پھینک دیا جائے
کپڑے اُتار کر اسے گلیوں میں گھسیٹا جائے
یا تھانوں کچہریوں، کٹہروں میں لایا جائے
آبروریزی کے بعد
سنگسار کیا جائے

یا کوڑے برسائے جائیں
پیدا ہونے پر
زمین میں زندہ گاڑ دیا جائے
یا پیدائش سے پہلے
زیرِ زمین گٹروں میں بہا کر
اس کے لا وجود لوتھڑوں سے چھٹکارا پا لیا جائے
محبت کی پاداش میں
دیواروں میں چن دیا جائے
یا حالتِ بیوگی میں
چتا کی لکڑیوں سے باندھ کر خاکستر کر دیا جائے

حضورِ اعلیٰ!
یہ ایوان عورتوں پر ظلم کے حق میں نہیں
کیوں نہ انہیں محبت کی مار ماری جائے
اور گھر جنت میں باندیاں بنا کر رکھا جائے
یا سات پردوں میں چُھپی حُوریں
آخر چادر اور چار دیواری کا تحفظ ریاست کی ذمہ داری ہے
امید ہے کہ اس انتہائی اہم معاملے پر
ایوانِ بالا میں بھی کُل جماعتی اتحاد قائم رہے گا
کیونکہ ان کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے

یہ جڑی بوٹیوں کی طرح اُگ رہی ہیں
انھیں تلف نہ کیا گیا
تو اس پاک صاف سرزمین پر
صالح مردوں کی فصل ختم ہو جائے گی
مادرِ گیتی پر استری راج ہو گا
معمول کے دنوں میں
پاک باز ریش برداروں کے لیے سانس لینا مشکل ہو جائے گا
تاریخ بخیر! جب پھانسی گھاٹ کم پڑ جاتے تھے
تو شہزادے حائضہ شہزادیوں کے قریب سے گزار کر
اُن کی بدبو سے ہلاک کیے جاتے تھے

ذی وقار ممبران سے درخواست ہے
کہ ماؤں، بہنوں، بیٹیوں اور ازواجِ منکوحہ و غیر منکوحہ سمیت
عورتوں کو مارنا ہر مرد کے لیے لازم قرار دیا جائے
اور اس کے لیے جنابِ اسپیکر!
یہ ایوان مردوں کے صوابدیدی اختیارات بڑھانے کی
پُرزور سفارش کرتا ہے

تالیاں! تالیاں!!
اجلاس ابھی جاری ہے ـــــــ

غیرت دار

درختوں سے بدفعلیاں
اور ہوا سے زیادتی کرنے والے
غیرت کھا کر
بے داغ پھولوں کے چہروں پر
موت کے ٹھپے لگاتے
اور کنواری تتلیوں کو زندہ جلا دیتے ہیں!

نظم ایک عورت کا پرس ہے

نظم خطوں میں لکھی ہوئی محبت تھی
جسے دیمک کھا گئی

نظم بادلوں کا درخت تھی
اور بارش کا پھول
جسے ہوا لے اُڑی

نظم ایک لڑکی کے ہاتھ کا لمس تھی
جسے ایک شاعر نے چھو لیا
اور وہ پرندہ بن گئی

نظم اے ٹی ایم سے نکلی ہوئی رقم تھی
جسے ایک عورت کا پرس کھا گیا!

ہوا کے ہاتھ میں راستہ ہے

ہوا کے پاس
دستکوں کی گٹھڑی ہے
سرگوشیوں سے بھرا تھیلا ہے
سنہری چابیوں کا گچھا ہے
بند دروازے کو نہیں معلوم
ہوا کے ہاتھ میں کیا ہے!

دسمبر کا تابوت

پہلے لاشوں کے تابوت اٹھتے تھے
اب موسموں کے تابوت اٹھائے جاتے ہیں
دسمبر کا تابوت کتنا بھاری ہے
وقت کندھا دینے آیا
تو تھک کر بیٹھ گیا

پتا نہیں کون سی تاریخ تھی
جب دھرتی ماں دولخت ہو گئی تھی
معلوم نہیں کون سا دن تھا
جب کتابوں اور کاپیوں کے اوراق
لہو میں تر بتر

مکتب کے کمروں اور راہداریوں میں
لاشوں کی طرح بکھر گئے تھے

دسمبر کا تابوت اٹھاتے اٹھاتے
سارے موسم ہانپ گئے ہیں
سولہویں دن سے آگے
ایک بھی دن نہیں جاتا
آخری دن نہیں آتا!

ہم بچے ہیں

ہم بچے ہیں
ہم اسکول جاتے ہیں
پارکوں میں اچھلتے کودتے ہیں
کھلونوں سے کھیلتے
اور غباروں میں ہوا بھر کر خوش ہوتے ہیں
ہم متحرک فلمیں اور کارٹون دیکھتے ہیں
اور چپس اور چاکلیٹس کھا کھا کر بیمار ہوتے رہتے ہیں
مگر باز نہیں آتے
ہم ضدی ہیں، لڑتے بھڑتے ہیں
پھر ایک ہو جاتے ہیں
ہم دُنیا کو اپنی آنکھوں سے،
اپنے عالمِ رُویا جیسا دیکھنا چاہتے ہیں

اور بڑے ہو کر
اسے بدلنے کا عزم بالجزم رکھتے ہیں

ہم بچے ہیں
ہمارے ہاتھوں کا گداز
پلاسٹک کی بے جان چیزوں میں جان ڈال دیتا ہے
اور ہمارے بوسوں کا لمس
مُردہ چہروں کو زندہ کر دیتا ہے
ہم بچے ہیں
ہمیں جنت اور دوزخ کا نہیں معلوم
لیکن یہ دنیا ہمارے دَم سے جنت ہے

ہم بچے ہیں
کالے نہ گورے، پیلے نہ براؤن
ہم ایک جیسے ہیں
ہم پوری دنیا کے بچے ہیں
اسکولوں میں
ہم فی سبیلِ اللہ قتل ہو جاتے ہیں
علم حاصل کرنے کی پاداش میں
ہمارے پھولوں جیسے جسموں پر

گولیوں کا مینہ برستا ہے
کتابیں اور کاپیاں ہماری ڈھال نہیں بن سکتیں
جنونیوں کے لیے
ہم رقصِ مرگ کا سامان ہیں
پَے در پَے ہوائی حملوں میں
ہم ملبے کا ڈھیر بن جاتے ہیں
بم دھماکوں سے سڑکوں پر
ہمارے اجساد جابجا بکھرتے ہیں
اور اعضائے رئیسہ
بھرے ہوئے کچرے کے ڈرموں میں پڑے رہتے ہیں
بارودی سرنگوں سے کھیلتے ہوئے
ہم بھک سے اُڑ جاتے ہیں
ہم ہر جگہ مارے جاتے ہیں
ہمارا خون ایک جیسا ہے، چیتھڑے ایک جیسے ہیں
ہمارے آنسو ایک جیسے ہیں
توتلا پن ایک جیسا ہے
مرجانے والے بوسے ایک جیسے ہیں

ہم بچے ہیں
ہمارا باہر بھیتر ایک ہے

ہمارا خود سے کوئی ملک ہے نہ خدا نہ مذہب
ہمارا ملک وہی ہوتا ہے جہاں ہم پیدا ہوتے ہیں
ہمارا مذہب وہی ہے
جو ہمارے ماں باپ کا ہے
اور ہمارا خدا وہ ہے جو ہماری خُرد خیالی میں آتا ہے
ہمارا خدا ہماری طرح معصوم ہے
وہ ہمیں مارنے کا سوچ بھی نہیں سکتا
ہم بچے ہیں
ہمیں بچے ہی رہنے دو
ہم کھلونا گنوں سے دنیا زیر کر سکتے ہیں
ہم پر اصلی گنیں مت چلاؤ!!
ہم جنت ہیں
ہمیں مار کر تم اور کون سی جنت کمانا چاہتے ہو؟

خالی کمرے میں صدائے سرزنش

وین والا
کب سے ہارن دے رہا ہے
تم اب تک سوئے ہوئے ہو
بچو اٹھو!
اسکول سے دیر ہو رہی ہے !!

(سانحہ اے پی ایس پشاور کے تناظر میں)

رُوح کے لیے دروازے کُھلے رکھو

رُوح دستک نہیں دیتی
وہ جہاں سے گزرتی ہے
چُپکے سے
آر پار گزر جاتی ہے
اور جہاں ٹھہرتی ہے
وہاں پوری طرح سما جاتی ہے

رُوح کے ہوتے ہوئے
جسم کی بارہ دری میں
کوئی اور داخل نہیں ہو سکتا

سوائے ہوا کے
اور بادل کے
اور بارش کے

رُوح جب چلی جاتی ہے
تو اُس کی جگہ رات لے لیتی ہے
کبھی نہ ختم ہونے والی
اتھاہ خاموش رات ——

بے وصل موسموں میں نظم

بے وصل موسموں میں
بادلوں پر حاشیہ نہیں لگایا جا سکتا
اور بارشوں میں
کاغذ کی نظمیں نہیں لکھی جا سکتیں

بدن کا لباس پہنے بغیر
روح کو چھپانا
اور محبت کے بدون
دھوپ اور چھاؤں کو ایک ساتھ اوڑھنا ممکن نہیں

نقادوں کی بادشاہت میں
پیدا ہوتے ہی

نظم کے سینے میں
اصطلاحات کا خنجر گھونپ دیا جاتا ہے
بناوٹی علامتوں اور استعاروں کے نام پر
ریت کے ایک ذرے کو صحرائے کبیر
درخت کو گوتم،
کھمبے کو خدا
اور گھونسلے کو پستان بنا کر
معنی کا سر قلم کر دیا جاتا ہے

سچ ہے
آسمان سے سفارتی تعلقات استوار کیے بِن
شاعری ہو سکتی ہے نہ محبّت
اور نہ زمین پر رینگنے کے حقوق ملتے ہیں!

نظم کا شجرہ

نظم کے شجرے میں
دکھوں کا طویل سلسلہ تحریر ہے
جسے پڑھتے ہوئے
کئی عینکیں بدلنی پڑتی ہیں
کئی بار تو کلاں کار شیشے سے دیکھنا پڑتا ہے
لیکن شاخوں اور جڑوں کی گنجلکوں میں
کچھ پتا نہیں چلتا
کہ دُکھ کا اَزلی اور جدی زرخیز بیج کہاں سے آیا
اور کن ابدوں تک پھیلا،
دکھ کائنات کے کس کھیت کی پیداوار ہے
اور کس الوہی پیوند کاری کا سدا بہار کرشمہ ہے
اور یہ زمین پر کیسے پُھولا پَھلا،

اسمگلنگ کے ذریعے آیا
یا ارتقائی راستوں سے درآمد ہوا
اور بڑھتے بڑھتے نظم کیسے بنا؟
آدم اور حوا کی متھ پرانی ہو چکی ہے
اولین گناہ انسانی کھاتے میں ڈالنا بھی
خدائی غلطی کے مترادف ہے
عقیدوں اور نظریوں کے زنگار میں
نظم کی اصلیت کہاں دکھائی دیتی ہے!

ملنے میں دیر لگا دیتے ہو

فرخ یار! ملنے میں دیر لگا دیتے ہو
یہاں تک کہ بارشیں پرانی ہو جاتی ہیں
اور ہوا بوڑھی ہو جاتی ہے
اور چھت پر پڑی ہوئی آہنی کرسیوں کا پینٹ اترنے لگتا ہے
اور دروازے کی گھنٹی
خاموش رہ رہ کر بجنا بھول جاتی ہے
اور مین گیٹ ذرا سی آہٹ پر خوامخواہ راہ گیروں
اور گھر کے سامنے کام کرتے ہوئے مزدوروں کے ساتھ الجھتا رہتا ہے

فرخ یار! لمحے کاؤنٹر پر پڑے ہوئے سکّے ہیں
جو گنتی میں متروک اور ڈی ویلیو ہو چکے ہیں
اور نئے نوٹوں کی گڈیاں
زمانوں کی فاختائیں ہیں

تمہارے ہاتھ سے اُڑ کر
جانے کہاں چلی جائیں، کس شاخ پر جا بیٹھیں
خواہشیں بینکوں کی برانچوں کی طرح ہیں
ایک سے دوسری، دوسری سے تیسری
تیسری سے چوتھی
آگے اور آگے
شہر در شہر پھیلتی چلی جاتی ہیں
کبھی پوری نہیں ہوتیں
لیکن مٹی اپنی جگہ نہیں بدلتی
جہاں کی ہو وہیں رہتی ہے

فرخ یار! تمہیں جو مشروب پسند ہے
وہ میں نہیں پیتا
پھر یہ کیا ہے؟
جو ہمارے درمیان چھلکتا رہتا ہے
اگرچہ زندگی دریا کے پانی کی طرح بہتی ہے
لیکن ہم کنارے نہیں کہ اسے دیکھتے رہیں
ہم انسان ہیں
ہمیں کسی نہ کسی منزل کی جانب تو چلنا ہے
اور کہیں نہ کہیں تو رکنا ہے

جہاں ہم سکون سے اپنی اپنی قبروں میں اتر سکیں
موت سے فلرٹ کرنا بظاہر اچھا لگتا ہے
اور اکثر شاعر کرتے ہیں
لیکن جب وہ آتی ہے
تو ہر لفظ کے معانی بھلا دیتی ہے
اور ہر چیز کے نقش مٹا دیتی ہے
یہاں تک کہ پاس بیٹھے ہوؤں کے چہرے بھی دھندلا جاتے ہیں
اور دیکھتے دیکھتے دُنیا کومے میں چلی جاتی ہے

فرخ یار! ڈاٹوں اور کنگوروں والا گھر جلدی بنا لو
وہاں رہ کر
تم مجھے آسانی سے یاد کر سکو گے
کرائے کے مکانوں میں
انسانوں کی طرح
یادیں بھی آکسیجن کی کمی کا شکار رہتی ہیں
فرخ یار! کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی دن تم آؤ
اور گھنٹی بجاؤ
اور دروازہ کھلے
اور پورچ میں کھڑی دم بخود ہوا منہ کھولے ہوئے
کچھ کہنے کی کوشش میں سرسراتی رہ جائے

میں تو وہاں نہ ہوتے ہوئے بھی تمہیں دیکھ لوں گا
پہچان بھی لوں گا
اور گلے بھی لگا لوں گا
لیکن تم ــــــ تم مجھے دیکھ نہیں پاؤ گے
رو بھی نہ سکو گے
اور ہونقوں کی طرح
میری لاوجود موجودگی کو گھورتے رہ جاؤ گے
فرخ یار! ملنے میں دیر نہ لگایا کرو!!

(فرخ یار کے لیے)

ہم موجود ہوتے ہوئے بھی نا موجود ہیں

اقتدار جاوید!
وقت کے سی سا پر
سارا وزن ایک جانب ڈال دینے سے
توازن بگڑ جاتا ہے
اور آدمی ایک ہی طرف جھکا رہ جاتا ہے
جب تک دوسری جانب کوئی بیٹھا ہُوا نہ ہو
ہنڈولے کا تختہ اُوپر اُٹھ سکتا ہے
نہ جھول سکتا ہے
لیکن کوئی مساوی الاوزان
بظاہر نا موجود، ہمہ وقت موجود ہے
جو ہماری بچگانہ اچھل کود

میں تو وہاں نہ ہوتے ہوئے بھی تمہیں دیکھ لوں گا
پہچان بھی لوں گا
اور گلے بھی لگا لوں گا
لیکن تم ـــــ تم مجھے دیکھ نہیں پاؤ گے
رو بھی نہ سکو گے
اور ہونقوں کی طرح
میری لاوجود موجودگی کو گھورتے رہ جاؤ گے
فرخ یار! ملنے میں دیر نہ لگایا کرو!!

(فرخ یار کے لیے)

ہم موجود ہوتے ہوئے بھی ناموجود ہیں

اقتدار جاوید!
وقت کے سی سا پر
سارا وزن ایک جانب ڈال دینے سے
توازن بگڑ جاتا ہے
اور آدمی ایک ہی طرف جھکا رہ جاتا ہے
جب تک دوسری جانب کوئی بیٹھا ہُوا نہ ہو
ہنڈولے کا تختہ اُوپر اُٹھ سکتا ہے
نہ جھول سکتا ہے
لیکن کوئی مساوی الاوزان
بظاہر ناموجود، ہمہ وقت موجود ہے
جو ہماری بچگانہ اچھل کود

اور وقت بے وقت کی دھاچوکڑی کے باوجود
ہی سا کو حالتِ توازن میں رکھے ہوئے ہے

اقتدار جاوید!
دوسروں کو ابد تک کھڑے رہنے کی سزا دے کر
خود جانے کس کس کے گِٹے گوڈوں میں بیٹھے رہتے ہو
اور جب وہاں سے اٹھتے ہو
تو اُن اونچائیوں پر ہوتے ہو
جہاں سے زمین ٹینس کی گیند لگتی ہے
اور اہلِ زمین ٹِمنی سی مخلوق دکھائی دیتے ہیں
اتنی بلندیوں پر تو
قدرتی ہوا کی بجائے آکسیجن کے سلنڈر درکار ہوتے ہیں
پتا نہیں وہاں سانس کیسے توڑتے ہو؟
اور زندہ کیسے رہتے ہو؟
میرا تو ایسے بالائی کُروں
اور افلاکی منطقوں میں دم گھٹنے لگتا ہے
دیکھو نیچے بونوں کی دنیا میں کتنی محبت ہے!

اقتدار جاوید! تم نہیں جانتے
تمہارے بارے میں سوچنا اور لکھنا

مجھے کتنا اچھا لگتا ہے
کیونکہ ناگڑیاں اور بادشاہ پور کے زمین و آسمان ایک جیسے ہیں
بادل، ہوائیں، کھیت، مویشی اور پرندے ہم شکل ہیں
دیواریں اور دیواروں پر
اُپلوں اور تھاپیوں کی نمونہ سازی ایک سی ہے
اور انہیں تھاپنے والی سہاگنوں کے حنائی ہاتھوں کی مہک
اور چوڑیوں کی کھنک ایک سی ہے
گلیاں اور مکان ایک دوسرے کے ہم زاد ہیں
یہاں تک کہ قطار در قطار بچھے
نواڑ کے پلنگ
اور بان، سَن اور سُوت کی بُنی ہوئی چارپائیاں
اور ان پر صدیوں سے بیٹھے ہوئے مکینوں کے پوز ایک سے ہیں
شادیوں میں اور اموات پر
صحنوں اور ڈیوڑھیوں کی رونقیں اور ویرانیاں ایک جیسی لگتی ہیں
برآمدوں، ستونوں، سیڑھیوں، جنگلوں اور جالیوں میں
جڑواں بھائیوں اور بہنوں جیسی مشابہت ہے
دنوں کی دھوپ اور راتوں کے اندھیروں میں اتنی مماثلت ہے
کہ کبھی کبھی تو میں غلطی سے
نیند میں چلتے ہوئے
ناگڑیاں کے بجائے بادشہ پور چلا جاتا ہوں

اور جب دروازوں کے پار بیٹھی
باتیں کرتی اور ایک دوسری کی چوٹیاں گوندھتی ہوئی عورتیں
اچانک کسی اجنبی کو دیکھ کر دوپٹوں سے سر ڈھانپنے لگتی ہیں
تو میں شرمندہ ہو کر
الٹے پاؤں اپنے خواب میں لوٹ آتا ہوں

اقتدار جاوید!
تم بینکوں والے بڑے چالاک ہوتے ہو
زمینوں، جائیدادوں اور رقموں کے ساتھ
مجھ ایسے سادہ دل بندوں کو بھی رہن رکھ لیتے ہو
خود تو کسی بڑی برانچ کی اونچی کرسی پر جا بیٹھتے ہو
اور ہمیں ساری عمر کے لیے نادہندہ قرار دے کر
اپنی چھوڑی ہوئی جگہوں سے بھی گزرنے نہیں دیتے
اقتدار جاوید! جب سے تم دینہ چھوڑ کر لاہور گئے ہو
میں میرپور نہیں گیا
کیونکہ تم سے ملے بغیر میں دینہ کراس نہیں کر سکتا
مجھے دوستوں اور شہروں کو بائی پاس کرنا نہیں آتا!

(اقتدار جاوید کے لیے)

اے رات! مجھ میں طلوع ہو!!

اے رات!
اے دوآبوں جیسی ٹھنڈی رات!
تُو آسمان کی طرح گمبھیر ہے
تیری گپھاؤں میں چاند اور ستارے ہیں
تیرے جنگل اور بیلے نظموں کی طرح پُراسرار ہیں
تیری اترائیوں میں نیلی گھاس لہلہاتی ہے
اور ابھاروں جیسے درختوں کی گھنی شاخوں پر
گلابی پروں والے پرندے پھڑپھڑاتے ہیں
تیری گھاٹیوں میں خواہشیں قیام کرتی ہیں،
نارنجی مشعلیں جلتی ہیں
تیرے نشیبوں میں سفید پھول کھلتے ہیں
اور تیرے پانیوں میں کنول تیرتے ہیں

تیرے جھینگروں کی آواز
مخمور نومی سماعتوں میں گونجتی ہے
تیری مقدس سرگوشیوں میں
کسی قدیم گیت کی لَے سنائی دیتی ہے
اور تیری گنگناہٹ
جیسے کائنات آخری ہچکی لے رہی ہو

اے رات!
اے ذائقوں اور نیندوں سے بھری ہوئی رات!
میں تیرے انتم کنارے پر
سورج لیے کھڑا ہوں
مجھے اذنِ باریابی دے!
مجھ میں طلوع ہو!!

محبت ایک نمبر ہے

محبت کئی دنوں سے غائب ہے
شاید موسم کی پہلی برف باری دیکھنے
کسی کوہستانی مقام پر چلی گئی ہے
یا کسی عظیم سانحے کی یاد میں
موم بتیاں روشن کرنے کے بعد
فلُو سے بستر میں دبکی پڑی ہے

پہلے تو وہ اکثر دکھائی دیتی تھی
دسمبر کی ہلکی ہلکی دھوپ میں
ہم دیوار مکانوں کی چھتوں پر
بے موسم پھلوں جیسی دلکش عورت کی طرح

بچوں کے ساتھ کینو چھیلتے، مونگ پھلیاں کھاتے
اور فٹ بال کھیلتے ہوئے
یا ستمبر کی اچانک امنڈ آنے والی تیز بارشوں میں
تار پر پھیلائے کپڑے سمیٹتے ہوئے
یا اپریل کی خوبصورت شاموں میں
فٹ پاتھ پر ٹہلتے ہوئے

محبت اب محض ایک نمبر ہے
ہر دل عزیز، اَن گنت سیل فونوں میں محفوظ
جو دلوں کے مکانوں سے نکل کر
انٹرنیٹ کی لامکانیت میں گم ہو گئی ہے

میں یوں ہی ٹیرس پہ بیٹھا
محبت سے چیٹنگ کرتے ہوئے
دھوپ اور تنہائی کی اکتاہٹ شیئر کرتا ہوں
اور بارش اور برف کا امکان بناتا ہوں
وہ جواب میں
کبھی اداسی کبھی سمائلی بھیج دیتی ہے

میرے پاس بسر کرنے کے لیے

جیون کے دو دن ہیں
لیکن محبت کو ایک پَل کے لیے بِسارنا مشکل ہے
سوچتا ہوں
خدا کے پاس تو ناکنار کائنات ہے،
زمانوں کی لازمانی ہے
وہ اپنی بے انت عمر کیسے گزارتا ہو گا؟

نظم کتنی بڑی ہو سکتی ہے؟

خواب کے لیے چاہیے
آنکھ بھر نیند
رات کے لیے چاہیے
مُٹھی بھر چاند
صبح کے لیے چاہیے
چٹکی بھر آفتاب
چلنے کے لیے چاہیے
پاؤں بھر راستہ
رُکنے کے لیے چاہیے
ہاتھ بھر جگہ
رونے کے لیے چاہیے
بوند بھر سمندر

کِھلنے کے لیے چاہیے
پُھول بھر ہنسی
کھیلنے کے لیے چاہیے
تتلی بھر اُڑان
اُگنے کے لیے چاہیے
گملا بھر مٹی
پریت کے لیے چاہیے
شریر بھر لمس
بھولنے کے لیے چاہیے
چھن بھر یاد
جینے کے لیے چاہیے
سانس بھر ہوا
مرنے کے لیے چاہیے
چُلو بھر دُعا
دھرتی کے لیے چاہیے
دھجی بھر امبر
نظم کے لیے چاہیے
ایشور بھر تنہائی!

نظم ہر جگہ موجود ہے

نظم جنگل نہیں
لیکن درختوں سے بھری ہوتی ہے
نظم پرندہ نہیں
لیکن چہکاروں سے گونجتی رہتی ہے
نظم محبوبہ نہیں
لیکن محبوبہ جیسی دلربائی رکھتی ہے
نظم بادل نہیں، بارش نہیں
لیکن پل کے پل بھگو دیتی ہے
نظم آدمی نہیں
لیکن دھڑکتی، سانس لیتی ہے
نظم خدا نہیں
لیکن ہر جگہ موجود ہے!

چرمینہ

ایک ساتھ پڑے ہوتے ہیں
کونوں کھدروں میں
یا وارڈ روبوں کے نچلے خانوں میں
ایک جیسے ہیں
رنگ و روپ میں، ڈیل ڈول میں
بس اتنا فرق ہے ہم دونوں میں
ایک دایاں ہے
دوسرا بایاں
انسان ہمارے بغیر دو قدم نہیں چل سکتا
پھر بھی ہمیں بے حقیقت سمجھتا ہے
اور ہمیں ہماری ہی نوک پر مارتا ہے

بچے ہمیں الٹا پہن کر خوش ہوتے ہیں
بڑے ایسا کریں
تو منہ کے بل گر پڑتے ہیں

انسانوں نے اپنی طرح
ہمیں بھی زنانہ اور مردانہ میں تقسیم کر دیا ہے
ہم جوڑا جوڑا ہوتے ہیں
مگر جفتی نہیں کر سکتے
عورات ہماری عاشق ہیں
ہم بھی ان کے پاؤں مرید ہیں
کبھی پاپوش و پَیزار
کبھی پا افزار و پا افشار
کبھی زیر پائی کبھی سینڈل
کبھی نعل کبھی پاتن
کبھی موزہ کبھی بوٹ کہلاتے ہیں

جب محنت کش بچے
دوسروں کے پاؤں پکڑ کر
ہمیں صاف کرتے، پالش سے چمکاتے ہیں
تو گراں گزرتا ہے

کاش ہم دنیا کا نظامِ زر بدل سکتے
پولیس کے ہاتھ آ جائیں
تو ملزم ہمیں دیکھتے ہی اقبالِ جرم کر لیتے ہیں
اور وردی والے تو
ہمارے بغیر کچھ بھی نہیں!

عراقی صحافی منتظر الزیدی نے
ہمارے ایک دس نمبری کو
امریکی صدر جارج بش پر پھینک دیا تھا
صدر تو بچ گیا
مگر ہماری قدر و قیمت بڑھ گئی
پوری دُنیا میں جُوتا جاتی ہونے لگی
ہمیں تھوڑا بُرا ضرور لگا
کہ یہ کام گلے سڑے ٹماٹروں اور گندے انڈوں کا ہے
لیکن سالوسی سامراج کے خلاف
کفش کاری کے عمل میں
اپنے استعمال پر خوشی بھی ہوئی

دُنیا کی آبادی کی طرح
ہم کروڑوں اربوں ہیں

نت نئے سائزوں ، ڈیزائنوں اور رنگوں میں
لیکن ہمیں اپنا براؤن اور کالا رنگ
بہت بھاتا ہے
نرم چرم ہیں
ہمیں خوبصورت نازک پاؤں اچھے لگتے ہیں
کوئی بے ڈھب اگر پہن لے
تو مجبوراً
اسے تنگ کیے، کاٹے بغیر نہیں رہ سکتے!!

کوئی ہوتا ہے

کوئی ہوتا ہے
ہمارے لیے
کہیں نہ کہیں
لیکن غبارِ زیست میں
دکھائی نہیں دیتا
راستہ
جس پر ہم چلتے ہیں
کہیں تو جاتا ہے
کسی شہر، کسی گلی میں
کسی نہ کسی دروازے تک
عُمریں گزر جاتی ہیں

اور ہم گھنٹی بجاتے ہوئے ڈرتے ہیں
کوئی گھر نہ ہُوا تو کیا ہو گا!

کوئی ہوتا ہے
ہمارا منتظر
کسی بالکونی میں اور ٹیرس پر
اور لاؤنج میں آتش دان کے پاس
عینک کے شیشوں پر آئی نمی صاف کرتے
اور کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے
اور ہم دفتر سے واپسی پر
سرما کی ہلکی ہلکی بارش میں
چھتری تانے ہوئے
گاڑیوں کے چھینٹوں سے بچتے بچاتے
گیلی سڑکوں پر چمکتی ہوئی روشنیوں میں
راستہ بھول جاتے ہیں
اور اپنے ہی گھر کے سامنے
کہیں اور جا نکلتے ہیں!

کوئی ہوتا ہے
ہمارے پاس

اندھیرے میں اور تنہائی میں
موبائل فون پر
آواز کو لمس بناتے ہوئے
زمانوں کی نیند سرگوشیاں کرتی ہے
اور ہم خوابوں کی
خاموش رہگزاروں پر چلتے ہوئے
دھند آلود موسموں میں
ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے
تنہا گوشوں میں
بینچوں پر بیٹھے
چُرمُر ہوئے، سُوکھے پتوں کی طرح
باتوں کے ڈھیر لگا دیتے ہیں
یہاں تک کہ بیلینس ختم ہو جاتا ہے!

کوئی ہوتا ہے
ہمارے جیسا
کسی کافی شاپ میں
کسی شاپنگ مال میں
کسی پارک میں، کسی فوڈ اسٹریٹ میں
کسی ٹرین، کسی میٹرو، کسی بس میں

کسی موٹروے کے کنارے
کسی انٹرچینج، کسی طعام گاہ میں
اور ہم گزر جاتے ہیں
انتہائی رفتار سے
وقت دونوں اطراف میں بھاگتا ہے
درخت، جھاڑیاں، ڈھابے اور کھوکھے
پیچھے رہ جاتے ہیں
ہموار سطحوں پر چوکڑی مار کر بیٹھے ہوئے مکان
سدا اِسی پوز میں
ہماری واپسی کا انتظار کرتے ہیں
مگر ہمارے پاؤں زمین پر کہاں ٹکتے ہیں
ہم اُڑن کھٹولوں پر سوار بادلوں کو چھونے لگتے ہیں
حتیٰ کہ آخری رن وے آ جاتا ہے
اور ہم اتر جاتے ہیں
لازمانی منطقوں پر
ہمیشہ کے لیے ــــــ!

معلوم اور نامعلوم کا دکھ

سعید احمد! ہم جیسوں کے لیے
معلوم کا دکھ
کسی دیہاتی بچے کی طرح ہے
جسے ماں کے ساتھ میلہ دیکھنے کی پاداش میں
باپ سے مار پڑی ہو
اور ہمیشہ کے لیے دِہ بدر کر دیا گیا ہو
لیکن نامعلوم کا دکھ چیست آں سے بنا ہوا ہے
جو ضرور کسی شاعر کے دل سے پھوٹا ہے
اور از دیادِ نمو سے
رُوئے زمیں پر پھیل گیا ہے
حال ہی میں
جاسوس سیاروں سے سنی جانے والی
کراس ٹاک سے انکشاف ہوا ہے

کہ دُکھ کی قلمیں دور دراز کے ستاروں پر بھی لگائی گئی ہیں
اور آسمان کے مختلف حصوں میں
اس کی تجرباتی کاشت کی جا رہی ہے
اگر یہ تجربہ کامیاب رہا
تو اہلِ آسمان پہلی بار دکھ کے ذائقے سے آشنا ہوں گے
اور یہ بھی سُنا گیا ہے
کہ اس کا کریڈٹ شاعروں کو دیا جائے گا
جس کے نتیجے میں
خدا ان کے ناکردہ گناہ معاف کر دے گا

سعید احمد! سچ کہوں تو دکھ لاوارث بچہ ہے
جسے کوئی بھی گود نہیں لینا چاہتا
سوائے تمہارے اور میرے جیسے شاعروں کے
وہ بھی اس لیے
کہ ہمارے پاس سوچوں کی چوسنیاں ہیں
خیالوں کے فیڈر ہیں
لفظوں کے کھلونے ہیں
خوابوں کے گیت اور لوریاں ہیں
نظموں کے جھولے ہیں
ہم کاغذی پیغمبر ہیں

اور جانتے ہیں کہ دکھ کو کیسے بہلایا جاتا ہے
ورنہ ہم کہاں اسے پالنے کے متحمل ہو سکتے ہیں
ہم اتنے نیکوکار کہاں ــــــ

سعید احمد! دن کے نیلاب کا خواب عکس بند کرتے ہوئے
تم کچھ غیر مرئی منظروں کو فلمانا بھول گئے
ورنہ مجھ پر تمہاری نظر ضرور پڑتی
میں بھی اسی دنیا کے آثارِ قدیمہ سے نکلا ہوا فوسل ہوں
میں بھی اسی شہر میں رہتا ہوں
جس کے نوتحریر شدہ اسکرپٹ میں
تم سب موجود ہونے کے باوجود
منسوخ کر دیئے گئے ہو
اور تمہارے حصوں کے کردار
اوپر والوں اور والیوں کو دے دیے گئے ہیں
شہر کو اب شاعروں کی نہیں
سرکاری مسخروں اور ڈنڈا بردار سیاسی ورکروں کی ضرورت ہے

سعید احمد! میں جو اس شہر کو اپنا آدھا آبائی سمجھتا تھا
اب یہاں پورا اجنبی ہوں
اور خوش ہوں

کیڑے مکوڑوں، گھاس کے تنکوں
مٹی کی کیاریوں، پودوں، پھولوں
اور ٹیرس پہ رکھے ہوئے گملوں
اور بیوی بچوں کے درمیان
شاعری اور زندگی کا حقیقی کردار
بذاتِ خود ادا کرتے ہوئے
اور بقلم خود لکھتے ہوئے
قرض کی دانش پیتا ہوں نہ مے
نہ کسی عظمت کدے میں بیٹھتا ہوں
نہ کسی عظیم مخاطبت کا حصہ ہوں
ورنہ تو سب مل کر (اس سب میں کوئی بھی شامل ہو سکتا ہے)
مجھے اجنبیت کی موت مار دیتے
اور آج میں تمہارے لیے یہ نظم نہ لکھ رہا ہوتا!!

(سعید احمد کے لیے)

دُنیا آب و گِل کے ذخیروں میں بٹی ہوئی ہے

یامین! سری نگر روڈ، محض ایک شاہراہ نہیں
ازل اور ابد کے درمیان چکراتی، لہراتی ہوئی نظم ہے
جو کہیں دل سے شروع ہو کر
صدیوں اور زمانوں کے سنگِ میل طے کرتی
وقت کی سرحدی چوکیوں سے گزرتی
دل ہی کے کسی منطقے پر ختم ہو جاتی ہے
دل، جس میں جانے کتنے جہلم، کتنے نیلم بہتے ہیں
کتنے ڈل اور کتنے سرینگر ہیں
لیکن دل سے باہر
دنیا آب و گِل کے ذخیروں میں بٹی ہوئی ہے
جہاں حدیں اور فاصلے نظموں سے نہیں
جھیلوں اور دریاؤں کے پانی سے ناپے جاتے ہیں

یامین! سرحد کے اُس پار سے آنے والے
بادلوں کی کلانچیں
اور بارش کے چھینٹے بتا رہے ہیں
کہ دشمن نے پانیوں کی جنگ جیت لی ہے
خوشبوؤں، گیتوں اور کہانیوں کو روک لگ چکی ہے
اور نظم
مٹی اور کنکریٹ کے پشتوں کے سامنے
بے بس پانی کی طرح ڈھیر ہوتی جا رہی ہے
اور جہلم
اب ایک بل کھاتی پتلی ریت کی لکیر کے سوا کچھ نہیں

یامین! دل کے مرتفع سلسلوں سے نکلتی ہوئی
ایک بے نام سڑک میری طرف بھی آتی ہے
جس پر کوئی سنگ میل نصب نہیں
کوئی چیک پوسٹ، کوئی ناکا نہیں
جس کے سنگ
کوئی جہلم، کوئی نیلم نہیں
بس محبت کی ایک دکھائی نہ دینے والی کاریز ہے!

(محمد یامین کے لیے)

میں تمہارے لیے نظم نہیں لکھ سکتا

اگر میں تمہارا انتظار کر سکتا
تو زمین پر روزِ شمار
کبھی نہ آتا

اگر میں تمہاری آنکھوں کے جنگل میں
درخت جیسا اُگ سکتا
تو میری جڑیں
کائنات کے دل تک پھیل جاتیں
اور خدا میری شاخوں پر
بادل بن کر برستا
اور پھول بن کر کھلتا

اگر میں تمہاری راتوں کی نیندیں اوڑھ سکتا

توکسی پارینہ خواب کی بارگاہ میں
دِیا بتی کرتا
تمہاری مقدس تاریکیوں سے
روشنی کی بشارت لیتا
اور دُنیا کو
اپنی آنکھوں سے طلوع ہوتے ہوئے دیکھتا

اگر میں تمہارے ساتھ چل سکتا
تو راستہ کبھی ختم نہ ہوتا
یہاں تک کہ
وقت اپنے پھٹے پرانے جاگرز پہنے
کسی زنگ آلودہ فولادی بینچ پر
تھک کر بیٹھ جاتا

اگر میں تمہارا ہاتھ تھام سکتا
تو سرمئی بادلوں کی سیڑھیوں پر پاؤں رکھتا
افق تا افق
قوسِ قزح کے پُل سے گزرتا
اور بچوں کی طرح
عمروں کے بوڑھے ساحلوں پر

کاسنی شاموں کے ڈھیر لگا دیتا
آسمان فرشتوں کے الوہی پروں
اور گلابی پرندوں کی اڑانوں سے بھر جاتا

اگر میں تمہارا لفظ بن سکتا
تو متن سے حاشیے تک
معانی جیسا پھیل جاتا
نظم، اگر میں لکھ سکتا
تو تمہارے لیے ایک نظم ضرور لکھتا!

رنگوں سے تصویر کہاں بن سکتی ہے!

آسمان کے نیلے کینوس پر
بادل پینٹ کرتے ہوئے
بارش ہونے لگتی ہے
برش اور ایزل بھیگ جاتے ہیں
اور رنگ پانی میں تحلیل ہو کر
بہنے لگتے ہیں

ہوا کی تصویر بناتے ہوئے
مُوقلم کے پر نکل آتے ہیں
اور کمرے میں رکھی ہوئی چیزیں
بے ترتیبی سے اُڑنے لگتی ہیں

رات ایک ہی رنگ میں رنگی ہوئی ہے

گہری آبنوسی
جو ہر رنگ پر چھا جاتی ہے

زیادہ تر خواب
رنگ دار نہیں، بلیک اینڈ وائٹ ہوتے ہیں
یا سیپیا جیسے بُھورے نسیجی
دُھندلے سے
جنہیں دیکھتے ہوئے
آنکھیں سمندروں کی تہ میں بیٹھ جاتی ہیں
خزانوں سے بھرے
ڈوبے ہوئے جہازوں کی طرح
جو صدیوں بِن دریافت ہوئے پڑے رہتے ہیں

دُنیا رنگوں اور چہروں سے بھری ہوئی ہے
جنہیں ایک ساتھ سمجھنا
اور مرکب کرنا مشکل ہے
قوسِ قزح
منشورِ آب سے گزرے بغیر نہیں بنتی!

کبوتروں والا پارک

گھر کے پاس
کبوتروں والے پارک میں
روز جاتے ہیں
میں اور فوزان
وہ گھاس پر بھاگتا
اور کبوتروں کے ٹوٹے ہوئے پر
ہاتھوں میں اُڑس کر
اُڑنے کی کوشش کرتا رہتا ہے
میں بینچ پر بیٹھا
نامعلوم نمبروں اور نامانوس ناموں سے آئے ہوئے
ایس ایم ایس ڈیلیٹ کرنے میں مگن رہتا ہوں

کبوتر ایک ہی لَے میں
غٹرغوں غٹ غوں غٹرغوں کرتے
دانہ چگتے رہتے ہیں
ہوا کبھی رکتی کبھی چلتی ہے
آرائشی جھاڑیوں، پست قد پودوں اور پھولوں کو
ہماری موجودگی سے کوئی فرق نہیں پڑتا
درخت اپنی اپنی جگہ پر استادہ
اکا دکا بادلوں کو بے دلی سے دیکھتے رہتے ہیں
سڑک پر سے گاڑیاں گزرتی رہتی ہیں
اور خدا کی طرح
اپنی ہی یکسانیت سے اُکتایا ہوا منظر
ہمیں دیکھ دیکھ کر
بور ہوتا رہتا ہے!

فوزان : میرا نواسا

نظم اور میں

پہلی دستک پر
نظم دوڑا دوڑی آتی ہے
ننگے پاؤں، کسی بچے کی طرح
اور جھٹ سے دروازہ کھولتی ہے
اور سامنے کسی کو نہ پا کر
ٹُسکنے لگتی ہے
میں چپکے سے اندر داخل ہو جاتا ہوں
نظم کو نہیں معلوم
کہ میں نے جناتی لفظوں کی
سلیمانی ٹوپی پہنی ہوئی ہے
مجھے کوئی نہیں دیکھ سکتا

شلوموہ! شلوموہ!!
نظم منہ بنا کر بیٹھ جاتی ہے

نظم میرے انتظار میں
رات بھر جاگتی ہے
دن بھر دریچے میں کھڑی رہتی ہے
پورے گھر میں پاگلوں کی طرح گھومتی ہے
نیم تاریک تہہ خانے میں
پرانی چیزوں کو ڈھونڈتے ہوئے
کئی بار ٹھوکر کھاتی ہے
نظم کونوں کھدروں میں چُھپے
چوہوں اور کاکروچوں سے بہت ڈرتی ہے
انہیں دیکھتے ہی چیخ مار کر بے ہوش ہو جاتی ہے
جب تک تازہ ہوا نہ ملے
اس کی سانس بحال نہیں ہوتی

نظم مجھے ایک لمحہ تنہا نہیں چھوڑتی
واش روم میں جاتے ہوئے بھی
احتیاطاً آنکھیں باہر سنگار میز پر رکھ جاتی ہے
تاکہ مجھ نادیدہ پر نگاہ رہے

شکر ہے ورنہ وہ مجھے

شاور لیتے ہوئے بے لباس دیکھ لیتی

جیسا کہ میں اسے کئی بار دیکھ چکا ہوں

حالانکہ حقیقت کو برہنہ دیکھنا اچھا نہیں ہوتا

آدمی پاگل ہو جاتا ہے

لیکن کیا کریں

ہم دیدہ ء دل سے مجبور ہیں

نظم اور میں ایک ساتھ پیدا ہوئے تھے

لیکن میں وقت سے پہلے بوڑھا ہو گیا

اور نظم وقت سے پہلے جوان

دونوں طفل مزاج، طفلِ افتادہ ہیں

ایک دوسرے کو شرارتاً چھیڑتے ہیں

قالین پر قلابازیاں کھاتے ہیں

ایک بار تو ٹوپی میرے سر سے گرتے گرتے بچی

نظم نے بھی شاید میری آدھی جھلک دیکھ لی

ایک دم دوپٹہ اوڑھ کر صوفے پر بیٹھ گئی

میری طرح

نظم کو پرندے اچھے لگتے ہیں

کبوتر، فاختائیں اور رنگ برنگی چڑیاں

اس کے باغوں میں اڑتی رہتی ہیں

لیکن وہ انہیں قیدِ قفس میں نہیں رکھ سکتی

دوسروں کے لفظ چوری کرنے والے شاعر

نظم کو ایک آنکھ نہیں بھاتے

وہ انہیں جادو کے زور سے

کوے اور گدھ بنا دیتی ہے

یا ترنگ میں ہو تو طوطا

تا کہ وہ کائیں کائیں کرتے رہیں

یا اپنا ہی ماس نوچتے رہیں

یا اپنے منہ میاں مٹھو بنتے رہیں

نظم کسی کے پاؤں کی جوتی ہے

کسی کا ازار بند

کسی کے گلے کا ہار

اور کسی کے سر کا تاج

لیکن گراں بہا ہے

سیل میں نہیں ملتی

مہنگے سماں میں

ذخیرہ اندوزوں کے ہتھے چڑھ جاتی ہے

جو اسے ذہنوں کے گوداموں میں بند کر دیتے ہیں

البتہ مہربان ہو جائے تو

کسی کسی کو مفت میں مل جاتی ہے

جیسا کہ مجھے

ورنہ بے نظم جینا کتنا اذیت خیز ہوتا ہے

یہ تو کوئی مرتا ہُوا شاعر ہی بتا سکتا ہے

جب تک نظم مجھے

لفظوں کے بغیر

دیکھنا، لکھنا اور پڑھنا سیکھ نہیں لیتی

میں بھی اُسے دکھائی نہیں دوں گا

اور یونہی تنگ کرتا رہوں گا

پورا سَو کیے بغیر

اکڑ بکڑ کھیلتا رہوں گا!!

عین سے عینی کے لیے ایک عقلیہ نظم

قرۃ العین !

تمہیں ابھی عقل نہیں آئے گی

ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے

محض چند لاکھ سال

جس کا اندازہ تمہارے پچھلے سے پچھلے سے پچھلے جنم کے

ایک ڈھانچے سے ہوا تھا

جو بیوقوفوں کے میوزیم میں پڑا تیسی (دو کم بتیس) دکھا رہا تھا

میں دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا

ماقبل ہو کہ مابعد

ہم دونوں ایک ہی زمانے کے فوسل ہیں

بس عین سے عقل داڑھ کا فرق ہے

ورنہ عورتوں کی صحیح عمر کہاں پتا چلتی ہے
کچھ تو بوڑھی ہو کر بھی پیدا نہیں ہوئی ہوتیں
اور کچھ پیدا ہو کر بوڑھی ہونے میں صدیاں لگا دیتی ہیں
کائناتی عمر یا روشنی کے سال
یہ مابعدالطبیعاتی پیمانے عورتوں کے مطلب کے نہیں
آئس ایج ہو یا سائبر ایج
وہ سدا ٹین ایج میں رہتی ہیں!

(قرۃ العین فاطمہ کے لیے)

نئے مکان میں ایک آبائی یاد

کھڑکیاں کھول دو
اور ہوا کو اندر وار آنے دو
یہ ضرور اُن راستوں سے آئی ہے
جن پر مَیں،
بارش ہو یا دُھوپ،
ننگے پاؤں چلا کرتا تھا!

محبت ترجمہ نہیں کی جا سکتی !

محبت ہر زبان میں محبت ہی رہتی ہے
دُنیا بھر میں
محبت کی ایک زبان، ایک گرامر ہے
اسے اور کس زبان میں ڈھالو گے؟
محبت علامت ہے نہ استعارہ
حقیقت نہ پیراڈوکس
تشبیہہ نہ امثال
تصوّر نہ تلازمہ
عِلّت نہ معلول
پیکر نہ خیال
ابلاغ و ابہام سے وَرا
محبت ہر زبان میں محبت ہی رہتی ہے
اسے کسی اور زبان میں ترجمہ نہیں کیا جا سکتا!!

دُنیا عجب چیستان ہے

دُنیا اپنی ہیئت اور ماہیت میں
متناقض بالروح ہے
لیکن کائنات کا سب سے خوبصورت نغمہ ہے
جسے خدا نے مکمل آرکسٹرا کے ساتھ ترتیب دیا ہے
اور آخری سُر اپنے پاس رکھا ہے
جب چاہتا ہے لگا دیتا ہے
مجھے تو خدا وائلن اور پیانو کی دھنوں میں سنائی دیتا ہے
اور اچھا لگتا ہے

دنیا ایک فوڈ اسٹریٹ ہے
اور ہم رُوحانی غذا کے پرہیزی ،

فاسٹ فُوڈ کے دلدادہ
پیزے اور برگر کھا کھا کر پھولتے جا رہے ہیں
یہی وجہ ہے
شاعروں، مصوروں، موسیقاروں اور گلوکاروں کی
آبادی کا تناسب کم ہو رہا ہے
دنیا بے ڈول جسموں سے بھرتی
اور لفظوں، رنگوں، سازوں اور آوازوں سے
خالی ہوتی جا رہی ہے

دُنیا عجب چیستان ہے
اس میں جتنے چہرے ہیں اتنی آنکھیں نہیں
اور جتنی آنکھیں ہیں اتنے خواب نہیں
جتنی راتیں ہیں اتنی صبحیں نہیں
جتنے معانی ہیں اتنے الفاظ نہیں

دُنیا ایک دستاویزی فلم ہے
ہم جس کے حقیقی کردار ہیں
اور اصلی ہیرو
ہم اپنا سُر اور اپنا الاپ ہیں
اپنی آواز کا طول موج ہیں

ہم اپنا آپ ہیں
مگر چہروں اور جسموں پر
دوسروں کے ماسک اور کاسٹیوم پہن کر
جینے کی اداکاری کرتے ہیں

دُنیا ایک کنویئر بیلٹ ہے
ہم جس پر فالتو سفری سامان کی طرح رکھے
آخری پرواز کے منتظر
اُٹھانے والے کو ڈھونڈ رہے ہیں!

راستہ کبھی دیوار نہیں بنتا

راستہ کبھی نہیں رُکتا
جب تک کہ بارش اسے بہا نہ دے
اور گھاس اسے ڈھانپ نہ لے

راستہ کبھی تاریخ نہیں بنتا
جب تک کہ رتھ کے پہیے
اس پر سے نہ گزریں
گھوڑوں کے سُم اسے روند نہ ڈالیں
اور پیادوں کے نقوشِ پا
خُون آلودہ نہ ہو جائیں

راستہ کبھی آنسو نہیں بنتا

جب تک کہ آغازِ شب میں
انتظار کرتی آنکھوں کے دیپ نہ جلیں

راستہ کبھی منزل نہیں بنتا
جب تک کہ پاؤں اسے پہن نہ لیں !

بادشہِ سخن کا فرمان

راستوں کو ہوا کے ساتھ نتھی کر دو
بادلوں کی گٹھڑیاں باندھ کر
پہاڑوں کی چوٹیوں سے نیچے پھینک دو
اور بارش کو
انجیر اور خوبانیوں کی طرح خشک کر کے
پیکٹوں میں محفوظ کر دو
پرندوں کی اُڑانیں
آسمان کے پارچے میں لپیٹ دو
اور پھڑ پھڑاہٹیں کشتیاں بنا کر پانیوں میں بہا دو
چھاؤں کو دھوپ سے
اور درختوں کو زمین سے الگ کر دو
دن کے اجالے اور شب کے اندھیرے کو
نظموں میں قید کر دو!!

محبت کی سمفونی

اگر تم مونا لیزا ہوتے
تو دُنیا ایک دائمی مسکراہٹ کی تصویر ہوتی

اگر تم پھول ہوتے
تو مٹی کی خوشبو سے لبریز ہوتے
اور زمین جنت کا باغ ہوتی

اگر تم لفظ ہوتے
تو میری سب سے خوبصورت نظم کا عنوان ہوتے
اور اگر کسی گیت کے بول ہوتے
تو پرندے تمہیں گنگنا رہے ہوتے

اگر تم پانی ہوتے
تو کسی ٹھہری ہوئی پیالہ نما جھیل میں
لبالب بھرے ہوئے ہوتے
یا کسی آبشار کا بہتا ہوا عمودی نغمہ ہوتے

اور اگر کچھ بھی نہ ہوتے
تو محبت کی سمفونی ہوتے!

(ڈاکٹر امجد پرویز کے لیے)

چلنے کے لیے سب سے اچھا راستہ دل کا ہے

شہزاد نیر! خاک اور آب کی نسبت بڑی پرانی ہے
دونوں ایک دوسرے میں رچ بس کر
ایک ہو جاتے ہیں
لیکن مٹی اور برف کا رشتہ
صدیوں اوپر تلے پڑے رہنے کے باوجود
نامیاتی طور پر کمزور ہے
ذرا سی آنچ سے
یا بھاری توپوں کے چند گولوں سے ٹوٹ جاتا ہے
حالانکہ برف اپنی ماہیّت میں پانی ہی کا جمود ہے

شہزاد نیر! زندگی کے جس سیاچن میں تم
آبی روح پہ خاکی جسم اور خاکی وردی پہنے
پُرامن زمانوں کے کھوج میں جنگیں لڑنے نکلے ہو

وہاں تو کھوجنے والا خود آئس برگ بن جاتا ہے
اور انگلیاں فراسٹ بائیٹ کا شکار ہو جاتی ہیں
زمان و مکاں منجمد ہو جاتے ہیں

شہزاد نیر! یہ آئس ایج کا نہیں گلوبل وارمنگ کا زمانہ ہے
زہریلے مادوں کی بارش ہو رہی ہے
اور زمین پر آلودگی بہہ رہی ہے
آسمان دھول اور دھوئیں کے بادلوں سے بھرا ہوا ہے
اوزون کی چھتری جگہ جگہ سے پھٹ چکی ہے
گلیشیئر پگھل رہے ہیں
اور سمندر ساحلوں سے اونچے ہو رہے ہیں
زیرِ ارض ذرا سی جنبش پر سونامی بن جاتے ہیں
اور ہنستی کھیلتی جزیروں اور جنگلوں جیسی سبز و شاداب زندگی
لاشوں کے صحرا میں تبدیل ہو جاتی ہے

شہزاد نیر! جہاں تم ہو
وہاں ہم سب تمہارے ساتھ ہیں
فرق یہ ہے کہ تم برف کے لباس میں ہو
اور بھاری بوٹوں اور رسّوں کے ساتھ چلتے ہو
اور اِگلو میں بیٹھ کر موت کا مذاق اڑاتے ہو

جبکہ ہم سادہ تن
کاغذی ہتھیار اور لفظی گولہ بارود اٹھائے
رضا کار شہریوں کی طرح برسرِ پیکار ہیں
تم تک پہنچنے سے پہلے
مخالف سمت سے آنے والی سرد ہواؤں میں
خبروں کی بازگشتیں
گولیوں کی طرح ہمارے سینوں میں چھید کرتی ہیں
اور ہماری نظمیں شہید ہو جاتی ہیں

شہزاد نیر! دوستوں کی طرف آنے
اور ملنے کے لیے سب سے اچھا راستہ دل کا ہے
آنکھوں کا کیا ہے
یہ تو ہر وقت بدلتے منظروں اور چہروں سے بھری رہتی ہیں
اور کسی بھی وقت دھوکا دے سکتی ہیں
تم دل کی راہ سے آئے تھے
اِس لیے اچھے لگے تھے
اور ملتے ہی اِس نظم میں بس گئے تھے
اب اس رستے پر گھاس اُگ آئی ہے!!

(شہزاد نیر کے لیے)

شہر مجھے مار کر ہی چھوڑے گا

میں جہاں جاتا ہوں
شہر میرے ساتھ رہتا ہے
کسی دوست سے ملنے اس کے گھر جاؤں
تو میرے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہو کر
صوفوں، کرسیوں، قالینوں
یہاں تک کہ فرش پر
ہر جگہ تجاوزات کی طرح پھیل کر بیٹھ جاتا ہے
اور اٹھنے کا نام نہیں لیتا
اپنی گنجان آبادیوں، ہجوم زدہ سڑکوں،
جابجا ناکوں، متبادل راستوں، رکاوٹوں، تلاشیوں،
وارداتوں، بم دھماکوں،
دھرنوں اور جلسوں جلوسوں کی باتیں سنا سنا کر
سارے ماحول کو بوجھل کر دیتا ہے

گفتگو میں یوں مخل ہوتا ہے
کہ کھانے کی میز پر بھی کان کھاتا رہتا ہے
پتا نہیں یہ سوتا کب ہے

دفتر جاتا ہوں
تو وہاں بھی
فائلوں سے نکل کر میز پر پھیل جاتا ہے
اور ہر جائز و ناجائز کام کی سمری پر
دستخط کرنے کے لیے مجبور کرتا ہے
انکار پر برا بھلا کہتا ہے
گالیوں پر اتر آتا ہے
سفارشیں کرواتا ہے
رشوت کی پیش کش کرتا ہے
شہر کے مسئلے لاینحل ہیں
میرے محدود اختیارات سے باہر
لیکن شہر یہ سب باتیں نہیں سمجھتا
وہ تو بس من مانی کرنا
اور ہر وقت کوئی نہ کوئی ہنگامہ بپا رکھنا چاہتا ہے
شہر بھی عجیب ہے
کوئی سچا عذر قبول نہیں کرتا

اور آوارہ کتوں کی طرح بھونکتا چلا جاتا ہے

کسی پارک میں چلا جاؤں
یا کسی ریستوران میں
تماشا گھر میں بیٹھا ہُوا ہوں یا سینما ہال میں
شہر میری جان نہیں چھوڑتا
میری پسند کے برعکس
ایکشن اور ہارر فلموں کا بڑا شوقین ہے
لیکن آرٹ فلمیں دیکھتے ہوئے بور ہوتا ہے
اور اکثر میرے کاندھے پر سر رکھ کر سو جاتا ہے
میرے ساتھ پاپ کارن اور کُرکُرے کھاتا ہے
کافی پیتا ہے، کشمیری چائے کا لطف لیتا ہے
شہر میری طرح دل کا مریض ہے
پھر بھی برگر، پیزا، فرائڈ چکن، فش اینڈ چپس، شاورما
ہر مضرِ صحت چیز ہڑپ کر جاتا ہے
اور دن میں کئی بار دوائیوں کا پھکا لینا نہیں بھولتا
شام کو جب واک پر نکلتا ہوں
تو گڈولنے میں چلتے، سیر گاڑی میں بیٹھے بچے کی طرح
یہ بھی چپکے سے ساتھ ہو لیتا ہے
دَم لینے کے لیے رکوں

تو بینچ پر مجھ سے پہلے براجمان ہو جاتا ہے
شہر کہیں بھی، کسی بھی طرح
خود چین لیتا ہے نہ مجھے چین سے بیٹھنے دیتا ہے

قبرستان جاؤں
تو قبریں گننے میں مصروف ہو جاتا ہے
کتبوں کی عبارت اور زندوں کا جنازہ پڑھنے لگتا ہے
اور میرے سرداب میں کسی اور کا مُردہ اُتار دیتا ہے
میرے لیے مرنے کی جگہ بھی نہیں بچتی
مجذوب مست شہر ننگ دھڑنگ گھومتا ہے
اور مزاروں کے احاطوں میں دھمالیں ڈالتا ہے
عدالتوں کچہریوں میں ہتھکڑیاں پہنے بڑھکیں مارتا ہے
جھوٹے گواہوں، مفروروں، قاتلوں، ڈاکوؤں
رشوت خور سرکاری اہل کاروں
اور پیشیوں سے تنگ آئے ہوئے،
ضمانتوں پر رہا شہر کے جوتے پھٹ جاتے ہیں،
جیبیں خالی ہو جاتی ہیں
لیکن فیصلے نہیں ہو پاتے
درس گاہیں جو شہر کے باہر ہوا کرتی تھیں
اب اس کے درمیان سکڑ سمٹ گئی ہیں

شہر اب دلوں، ذہنوں اور کتابوں میں نہیں
بینکوں، پلازوں، سپر مارکیٹوں اور نئی رہائشی اسکیموں میں بستا ہے
اور اس کی قدیم لائبریریوں میں
چمگادڑیں پھڑپھڑاتی اور اُلّو بولتے ہیں
شہر میرا ازلی و ابدی دشمن،
گاؤں سے نکلتے ہی میرے ساتھ چپک گیا تھا
لگتا ہے مجھے مار کر ہی چھوڑے گا

شادی ہو یا مرگ، یہ ہر موقع پر جمع ہو جاتا ہے
اور کسی باتونی سمروت کی طرح پرانے قصے چھیڑ دیتا ہے
شہر مجھ سے زیادہ یادِ ایام کا شکار ہے
گھر واپس آتا ہوں
تو دروازے تک مجھے چھوڑنے آتا ہے
جیسے میں کہیں بھاگ ہی جاؤں گا
میں خوش ہوتا ہوں کہ شہر سے جان چھوٹ گئی
لیکن لاؤنج میں قدم رکھتے ہی
ٹی وی اسکرین پر نظر پڑتی ہے
جہاں شہر کے بارے میں
کوئی نہ کوئی بریکنگ نیوز چل رہی ہوتی ہے
شہر مجھ سے پہلے گھر میں گھس آتا ہے!

کچرے کے ڈھیر پر لاوارث نوزائیدہ

کب سے پڑا ہوں
کوئی اُٹھانے نہیں آیا
کُتّے، بلیاں اور چوہے
کاٹ کاٹ کر کھا رہے ہیں مجھے
گُناہ زادوں کو
اُٹھا کر جُھولے میں ڈالنے والا
بابا شاید مر گیا ہے
اب تو آدھا رہ گیا ہوں
صبح تک کوئی نہ آیا
تو بلدیہ والے کچرے کے ساتھ
مجھ بچے کھچے کو بھی اُٹھا لے جائیں گے!

بابا: عبدالستار ایدھی

خدا معبدوں میں گُم ہو گیا ہے

خدا معبدوں کی راہداریوں میں گُم ہو گیا ہے
دلوں سے تو وہ پہلے ہی رخصت ہو چکا تھا
خودکش دھماکوں کے خوف سے
اب اس نے مسجدوں کی سیڑھیوں پر بیٹھنا بھی چھوڑ دیا ہے

خدا واحدِ حقیقی ہے
اسے کیا پڑی ہے
کہ وہ انسانوں کی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو کر
جوتوں اور کپڑوں کے ساتھ اِدھر اُدھر بکھر جائے

شاعروں اور دہشت گردوں نے
خدا کو اتنی کثرت سے استعمال کیا ہے

کہ تنگ آ کر وہ نظموں سے اور دنیا سے غائب ہو گیا ہے
اور کائنات کے کسی ایسے گوشے کی طرف نکل گیا ہے
جہاں ان کی نظروں سے محفوظ رہ سکے
وہ اتنا بے بس کبھی نہیں تھا
جتنا اب ہے

خدا کائنات کا سب سے بڑا کلیشے ہے
جسے ترک نہیں کیا جا سکتا!

ہم خود فریبی کا شہکار ہیں

محبتیں اور فلسفے کبھی قدیم اور جدید نہیں ہوتے
ہم بدل جاتے ہیں
ہماری محبتیں
فلموں کی طرح کامیاب یا فلاپ ہوتی ہیں
اور ہمارے فلسفے
ہمارے ساتھ ہی سرما خوابی میں چلے جاتے ہیں
ہم جو خود فریبی کا شاہ کار ہیں
سمجھتے ہیں کہ امر ہو گئے ہیں
حالانکہ ہماری موت کا انتظار کیے بغیر
دوسرے ہماری جگہ لے لیتے ہیں

ہم وقت کا بگڑا ہوا چہرہ ہیں
جس پر غازہ لگا لگا کر

میک اپ کی تہیں چڑھا چڑھا کر
ہم نت نئی اداکاری کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں
اور نادیدہ ہدایت کار کے ایک اشارے پر
ناچنے لگتے ہیں
حتیٰ کہ سین کٹ یا او کے ہوئے بغیر
ہماری زندگی کی فلم مکمل ہو جاتی ہے!

اور ایک اُلوہی تیقُّن سے مسکرا دیتی
خدا کائنات کے آخری گوشے سے
شتالے اور سرسوں کے پھول دیکھنے
ایک چھوٹے سے گاؤں میں آ جاتا

نظم بڑی ہوتے ہوتے
پورے چھ فٹ کا آدمی بن گئی!

یکم اپریل ۱۹۵۴ء

آج کے دن
ماں نے ایک نظم کو جنم دیا
جو ہے جتنی
چھوٹی سی نظم
جسے ایک جار میں بند کیا جا سکتا تھا
سب ہنستے تھے
اور کہتے تھے
نظم زندہ نہیں بچے گی

ماں نظم کو گود میں لیے بیٹھی رہتی
نظم کے ہاتھ چومتی

Scanned by CamScanner
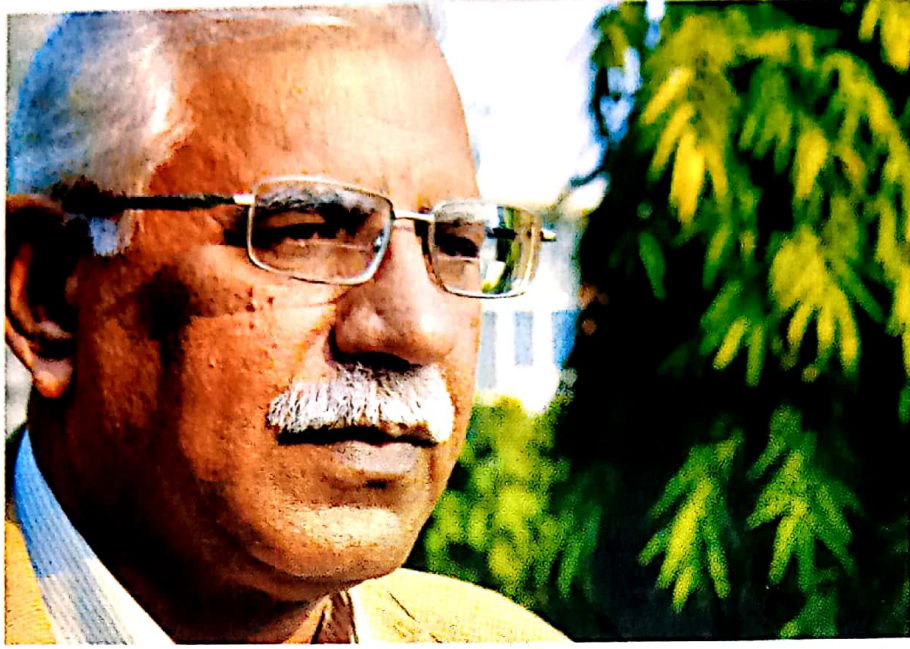
- پانی میں گم خواب (نظمیں)
- عراب جی سو گیا ہے (نظمیں)
- ملبے سے ملی چیزیں (نظمیں)
- تیسرے قدم کا خمیازہ (نظمیں)
- زرد پتوں کی شال (مختصر نظمیں)
- ڈریمز لاسٹ اِن واٹر (نظموں کے انگریزی تراجم)
- اے مَین آؤٹ سائیڈ ہسٹری (نظموں کے انگریزی تراجم)

facebook
book corner showroom
website
www.bookcorner.com.pk
email
info@bookcorner.com.pk

ربِ لامکاں کا صد شکر ہے کہ اس نے ہمیں توفیق دی کہ ہم اردو ادب کی کتب کو سافٹ میں تبدیل کر سکے۔ اسی صورت میں یہ کتاب آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ مزید اس طرح کی عمدہ کتب حاصل کرنے کے لئے ہمارے گروپ میں شمولیت اختیار کریں۔

انتظامیہ برقی کتب

گروپ میں شمولیت کے لئے:

عبداللہ عتیق: 8848884 347 -92+

محمد ذوالقرنین حیدر: 3123050300-92+

اسکالر سدرہ طاہر صاحبہ: 0120123 334 -92+